واقعات کا مجمل ذکر ہے البتہ قیام پاکستان کے بعد خصوصاً جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دور کے حالات و واقعات زیادہ تفصیل سے پیش کئے گئے ہیں، اس اعتبار سے یہ کتاب اس دور کے حالات کی ایک دستاویز ہے، دوسرے باب میں شورش صاحب کی پیدائش سے وفات تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں، اس سلسلہ میں ان کے خاندان، تعلیم و تربیت، گھریلو اور سیاسی زندگی کے واقعات اور قید و بند کی سرگذشت کے علاوہ ان کے اخلاق و عادات، خوراک، پاکستان سے محبت اور عشق رسول کا تذکرہ بھی ہے، اسی باب میں ملک و ملت کے سیاسی رہنماؤں اور ارباب قلم کے وہ تاثرات بھی نقل کئے گئے ہیں۔ جو آغا صاحب کے متعلق ان کی زندگی میں یا وفات کے بعد تحریر کئے گئے تھے، پہلے نثری اور آخر میں منظوم تاثرات درج ہیں، تیسرے باب میں شورش صاحب کی تصانیف نظم و نثر کا مفصل تعارف کرایا ہے اس میں ہر تصنیف کی خوبیاں اور خصوصیات پوری طرح واضح کی ہیں، چوتھا باب شورش صاحب کی خطابت کے جائزہ پر مشتمل ہے، اس میں ان کی خطابت کی دلکشی کو نمایاں کرنے کے لیے تقریروں کے بعض نمونے بھی دئے ہیں، پانچویں باب میں ان کی شاعری پر بسوط تبصرہ کیا ہے، اس میں موضوعات و اصناف کے لحاظ سے ان کی شاعری کی خصوصیات نمونوں کے ساتھ دکھائی گئی ہیں، چھٹا باب ان کی صحافت پر بحث و گفتگو کیلئے خاص ہے، اس میں پہلے آزادی سے قبل جن اخباروں اور رسالوں سے وہ وابستہ رہے ان کا ذکر ہے، اور آخر میں ۱۹۴۹ء میں جاری ہونے والے ان کے نجی ہفت روزہ اخبار چٹان کے مقاصد و خصوصیات بیان کرکے ان کی صحافت نگاری کی خصوصیات و خدمات پیش کی ہیں، آخری باب میں ان کی نثر نگاری پر تبصرہ ہے، جس میں مختلف اصناف نثر میں ان کے کمالات اور انوکھے اسلوب نگارش کی دلآویزی کا ذکر ہے، جناب شورش کاشمیری مرحوم کی زندگی ہنگامہ خیز انقلاب پسند اور مجاہدانہ تھی، اس اعتبار سے یہ کتاب دلچسپ اور سبق آموز ہے، مگر وہ جن تحریکوں اور اشخاص سے زیادہ متاثر ہوئے ان کا مستقل ذکر ہونا چاہیے تھا۔

جلد ۱۴۰ ماہ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۷ء عدد ۲

مضامین

مقالات

شذرات

کراچی کے ایک مکتوب سے یہ المناک خبر ملی کہ استاذی المعظم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی اہلیہ محترمہ ۲۳ جولائی
۱۹۸۶ء کو اپنی اولاد کو آنسوؤں کے سیل رواں میں چھوڑ کر عالم جاودانی کو سدھار گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

یہ تعزیتی تحریر دارالمصنفین کے احاطہ میں اس گھر میں لکھی جا رہی ہے جہاں حضرت استاذی المحترم نے اپنی زندگی کے بہتر
بلکہ بہار آفریں اور مشک آگیں دور گذارے ہیں، وہ یہاں کے کتب خانہ میں اپنی میز پر سیرۃ النبیؐ، معارف کے شذرات
علمی، مذہبی اور ادبی مضامین میں اپنے علم و عرفان کے مروارید، نظر و فکر کے زمرد اور ادب و دانش کے در شاہوار بکھیر کر اس گھر میں
داخل ہوتے تو پہلے اپنی سب سے چھوٹی اولاد کو اپنی آغوش شفقت میں لیتے، پھر ان کی اور اولادیں ان کے یمین و یسار میں
جاتیں جس کے بعد علمی میز پر ان کو جو تکان ہوتی وہ یکایک دور ہو جاتی، اور ان کے چہرے پر بشاشت، ان کی ہر ادا
نزہت اور ان کی بزرگی میں روحانیت دکھائی دیتی، وہ اپنے بچوں کے شگفتہ چہروں کو دیکھتے تو ان کی آنکھیں جنت
بن جاتیں، ان کی معصوم باتوں کو سنتے تو ان کے کان فردوس گوش بن جاتے، پھر فضا میں پدری مہر و محبت کی کوثر و سلسبیل بہنے
لگتیں، اسی فضا میں ان کی اہلیہ محترمہ نے بھی زندگی گذاری، اس گھر میں وہ تقریباً ۱۹ برس رہیں۔

سید صاحب اپنی گھریلو زندگی میں بہت ہی نفاست پسند تھے، ان کی ہر چیز بہت سلیقہ، صفائی، اور ستھرائی سے
رہتی، مرحومہ بھی فطری طور پر بہت ہی سلیقہ مند، مہذب، عبادت گذار اور باوقار تھیں جس سے سید صاحبؒ کو اپنی زندگی گذارنے
میں بڑی مدد ملتی رہتی، دارالمصنفین کی قلیل آمدنی میں دونوں کی زندگی نہ صرف صاف ستھری بلکہ کیف و مسرت سے معمور رہی،
سید صاحبؒ کے ساتھ بھوپال بھی گئیں، پھر کراچی منتقل ہو گئیں، لیکن آخر وقت تک فرماتی رہیں کہ جو مسرت اور انبساط بھری زندگی
دارالمصنفین میں گذری وہ کہیں اور نہیں ملی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو چار بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا، سید صاحبؒ کی پہلی اہلیہ محترمہ مرحومہ سے ایک بیٹے عزیزی
ابو سہیل خوش گوار زندگی گذار رہے ہیں، مرحومہ اپنی محبت بھری وضعداری میں جب کبھی کوئی خط لکھتیں تو آخر میں والدہ
ابو سہیل ہی لکھ کر اس کو ختم کرتیں، ان کے فرزند ارجمند عزیزی ڈاکٹر سلمان ندوی نے اپنا نام علمی دنیا میں اونچا کیا ہے، لیکن وہ
عالی ظرفی میں والدہ سلمان لکھنے کے بجائے زیادہ تر والدہ ابو سہیل ہی لکھنا پسند کرتیں۔

وہ اپنی تمام اولاد کو اپنی زندگی میں آباد، خوش اور خرم دیکھ کر اس دنیا سے رخصت ہوئیں، اپنے نواسے نواسیوں
اور پوتی کی زندگی کی بہاریں بھی دیکھیں، ایک خوش نصیب ماں کی حیثیت سے اس دار فانی سے رخصت ہوئیں، البتہ اپنے
اور ہر دلعزیز شوہر کی وفات کے بعد تقریباً ۳۴ سال بیوگی کی زندگی گذاری، مگر ان کی یادوں کی جوت جگا کر ہر طرح شاکر اور
رہنے کی کوشش کی، ان کی وفات کے ۱۰ برس کے بعد حکومت پاکستان نے ان کے لیے ایک وظیفہ مقرر کر دیا تھا، یہ کوئی

رقم نہ تھی، مگر قناعت، توکل، صبر و رضا کو اپنی نسوانی زندگی کا زیور اور ہنسی خوشی کے موتیوں کو اپنے گلے کا ہار بنا کر بچوں کے ساتھ
زندگی گذار دی۔

یہ راقم ۱۹۳۵ء سے ان کی زندگی کے آخری لمحات تک ان کی مخلصانہ شفقت کی تسنیم سے سیراب ہوتا رہا، ایک ماں
کی مہر و محبت کی جتنی ضیا باری ہو سکتی ہے، وہ ایک حقیقت بن کر میری زندگی کے ذرہ ذرہ میں چمکتی رہی، میری جوانی
ایک اندوہ ناک سانحہ سے بالکل برباد اور تباہ ہونے کو تھی لیکن انھوں نے دستگیری کی، اور اس کو سنوار کر از سر نو
بسر کرنے میں فرشتہ رحمت بن گئیں، ۱۹۵۵ء سے کراچی برابر جاتا رہا ہوں، یہ شہر میری نگاہوں میں اس لیے جاذب
ہے کہ یہیں استاذی المحترم کا مزار پُر انوار ہے، پھر جب وہاں پہنچ کر مرحومہ کی خدمت میں حاضر ہوتا، تو ایسا معلوم ہوتا
کہ مہر مادری کی مہتابی چھٹکی ہوئی ہے اور میں گلشن محبت کی خوشبوؤں سے معطر ہو رہا ہوں، گذشتہ مہینہ پاکستان کے سفر میں ۳،
جولائی ۱۹۸۶ء کو ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ اپنی تشویشناک علالت کی وجہ سے نیم بے ہوشی کے عالم میں تھیں، ان کی
آنکھیں کھلیں تو پہچانا، ہاتھ پکڑ کر بولیں بیٹا! اچھا ہوا تم آگئے، آخری ملاقات ہو گئی، اب دنیا سے رخصت ہو رہی ہوں، ان پر
موت کا کوئی ہراس طاری نہ تھا، مجھ کو دیکھ کر ان کی اگلی سی توانائی آگئی، زندگی کی بزم رفتہ کی کہانی شروع کر دی، اسوقت
ایسا معلوم ہوا کہ وہ قضا کی دلھن بنی ہوئی ہیں، ۱۶ جولائی تک ان کی عیادت کے لیے برابر حاضر ہوتا رہا۔

حضرت سید صاحبؒ کی سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم پر پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے ایک لاکھ روپیے کے انعام
کا اعلان کیا تھا، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے یہ طے فرمایا تھا کہ اس میں سے ۵۰ ہزار روپیے کی رقم مرحومہ کی خدمت
میں پیش کی جائے، اور بقیہ ۵۰ ہزار دارالمصنفین کو ملے، کوشش تھی کہ یہ رقم مرحومہ کی زندگی میں ان کے پاس پہنچ جائے،
تاکہ ان کو کم از کم یہ تسلی ہو کہ ان کو بھی اپنے نامور شوہر کی علمی ناموری سے کچھ نہ کچھ مادی اور مالی فائدہ پہنچا، مگر یہ رقم
ان کے پاس اُسوقت پہنچی، جب وہ کائنات کی ساری دولت سے بے نیاز ہو چکی تھیں،

حضرت سید صاحبؒ کے روحانی خلیفہ جناب مولانا غلام محمد نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:-

"وقعت الواقعة کل بروز پنج شنبہ ۲۶ ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ ۲۳ جولائی ۱۹۸۶ء کو صبح کے ٹھیک
۸ بجے علیا پیرانی صاحبہ رحلت کر گئیں، بڑے سایۂ شفقت اور بڑی دعاؤں کی پشت پناہی سے ہم سب محروم ہو گئے،
اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت کرے، اور درجات عالیہ عطا فرمائیں، آخری وقت تک وہی بے ہوشی کی سی
کیفیت رہی، نماز جنازہ جامع مسجد بیت المکرم گلشن اقبال میں نماز عصر کے فوراً بعد پڑھی گئی، امامت
کی سعادت سلمان میاں اور سب اہل خانہ کے اصرار پر راقم حقیر ہی کے حصہ میں آئی، ماشاء اللہ پیرانی صاحبہ
پر سکینت کا یہ عالم تھا کہ جیسے ہی جنازہ کے قریب آیا، محسوس ہوا کہ کسی نے میرے سینہ میں برف رکھ دی، جنازہ
میں اہل اخلاص و محبت کا خاصا اجتماع رہا، مولانا ناظم ندوی، پروفیسر فخر الحسن، حاجی علی محمد صاحب، مولانا
عبدالشکور، جناب نومی والا اور آپ کے داماد ڈاکٹر راشد مصطفیٰ وغیرہ شریک تھے، بیت المکرم کے وسیع

رقبہ میں سات بڑی صفیں ہو گئی تھیں، الحمد للہ ریڈیو پر بھی اطلاع نشر ہوئی، اخباروں میں بھی خبر چھپی، گورنر سندھ اور عمائدین حکومت کی طرف سے اخبارات میں تعزیتی بیانات چھپے۔ ملک پلانٹ سے متصل قبرستان میں ایک صاف ستھری جگہ پر ایک نیم کے سایہ دار درخت کے نیچے مرحومہ کی ابدی خوابگاہ بنی ہے۔ رحمہا اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃ۔ یوں تو گھر کا ہر فرد دو فور غم میں مبتلا تھا، مگر میری اہلیہ بتا رہی تھیں کہ منجھلی اور چھوٹی صاحبزادیوں کا حال بہت ہی برا تھا، مگر ہمت سے کام کر رہی تھیں، پیرانی صاحبہ کو غسل خود صاحبزادیوں نے اپنے ہاتھوں سے دیا، ماں کی کیسی خوش نصیبی اور بیٹیوں کی کتنی بڑی سعادت اندوزی ہے۔"

وہ وہاں جا چکیں، جہاں ایک روز سب کو جانا ہے، اپنے جلیل القدر شوہر کی ناموس اور عظمت اپنی بیوگی میں جس زہد و عبادت سے برقرار رکھا، پھر جس سے ملیں اوس کو اپنی بزرگانہ محبت سے جس طرح سرشار، اور اپنے پیچھے اپنے آن بان کی جو روایتیں چھوڑ گئی ہیں، ان کی یادوں کی شمع روشن کر کے ان کی اولاد ان کی خوبیوں کے جلووں سے اپنی خلوتیں آباد کرتی رہے گی، ان کے جاننے اور ملنے والوں میں کون ہے، جو ان کو یاد کر کے سوگوار نہ ہوگا، میرے لیے ان کی یاد کی بے کلی مخزن تسکین بنی رہے گی، حضرت سید صاحبؒ کے سایۂ عاطفت اور مرحومہ کی شفقت مادری کے جلو میں دارالمصنفین کے احاطہ کی زندگی میں جو کشش یہاں کی جو دلکشی یہاں کی شام میں جو دل فریبی اور یہاں کی رات میں جو دل افروزی پائی، ان کی یادوں کے غم کو آغوش میں چشم اشک آگین کے ساتھ بقیہ زندگی گذرے گی، دعا ہے کہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک اور پاک صفات مصنف کی شریک حیات کی تربت کو اللہ جل شانہٗ اپنی رحمتوں اور برکتوں کے پھولوں سے ہمیشہ نکہت بیز رکھے، آمین! ثم آمین!

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝

مقالات

سیرتِ نبویؐ اور مستشرقین

منٹگمری واٹ کے افکار کا تنقیدی جائزہ

از
ڈاکٹر عماد الدین خلیل
المعهد الحضاری، الموصل، عراق
ترجمہ: عبید اللہ کوٹی ندوی، رفیق دارالمصنفین،

سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کا ادراک ہونا چاہئے کہ ایک مسلمان خواہ اس کی تعلیمی استعداد کچھ بھی ہو، وہ سیرت نبویؐ کے بارے میں اپنے نقوش و تاثرات کو ایک بدیہی حقیقت سمجھتا ہے، اس کے ان تاثرات کا سرچشمہ وہ تاریخی روایات نہیں ہیں، جن میں سے ایک حصہ ضعیف ہے، تو دوسرا حصہ شک و ریب کی حالت میں ترتیب دیا گیا ہے، ممکن ہے مسلمانوں میں سے کسی نے سیرۃ نبویؐ پر کوئی ایک کتاب بھی باقاعدہ نہ پڑھی ہو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس کے تاثرات جن ذرائع سے حاصل ہوئے ہیں، وہ ان زمینی سرچشموں کے مانند ہیں جن سے پانی گر کر ایک دریا کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اپنے گرد و پیش قرآن و حدیث سے حاصل ہونے والے معلومات اسلامی ایمانی زندگی کے سچے تجربات کی راہ سے وہ سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اچھی طرح

واقف ہو جاتا ہے، واقعات سیرت کے بارے میں اس کی واقفیت اسی اجتماعی شعور کا نتیجہ ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل تک سیرت کے واقعات کو منتقل کرتا رہا ہے۔ سیرت نبویؐ کے ساتھ گہری وابستگی اور اس کا احترام ایک مسلمان کے قلبی تاثرات کا حقیقی سرچشمہ ہے، ان تاثرات میں اس وقت اضافہ ہو جاتا ہے جب وہ تاریخی حقائق کا مطالعہ کرتا ہے، تاہم مذکورہ بالا محرکات یکجا ہو کر ایک مسلمان کے لیے سیرت نبویؐ کے بارے میں ایک ہی نقطۂ نظر پیدا کرتے ہیں، اس سے صرف وہی لوگ مستثنیٰ ہیں، جو شاذ و نادر مخصوص حالات کی بنا پر کسی بھی درجہ میں اسلام کے باغی ہوں یا انھوں نے غیر اسلامی مصادر کا مطالعہ کر کے اسلام کے برعکس دوسرے اثرات قبول کر لیے ہوں۔

احترام و پسندیدگی، اور یقین و محبت کے احساسات سے ایک مسلمان کا جو عقیدہ استوار ہوتا ہے، اسی سے سیرت کے بارے میں اس کا رویہ متعین ہوتا ہے، اور اسی سے سیرت کی پوری ترجمانی اور تفہیم ہو سکتی ہے، لیکن جب مستشرقین کی طرف سے صاف اور صریح باتوں اور تسلیم شدہ حقیقتوں کا انکار کیا جاتا ہے، تو ایک مسلمان عام حالات میں ان سے متاثر نہیں ہوتا، بلکہ اس کے اندر تنفر اور بے اطمینانی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

سیرت کا تعلق عالم غیب سے ہے، اس میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے درمیان رابطہ کا ذریعہ وحی آسمانی ہے، آپؐ نے جو سوسائٹی بنائی وہ ایمان کی جیتی جاگتی تصویر اور آیندہ نسلوں کے لیے نمونہ ہے، کیا اس کا ویسا ہی تحلیل و تجزیہ کیا جائے گا، جیسا کہ کیمسٹری کی تجربہ گاہ میں ایٹمی ذرات اور مادی عناصر کا تجزیہ کیا جاتا ہے، یا جس طرح انجینئر کی میز پر رقبہ، زاویہ اور خطوط کے خاکوں اور نقشوں کا معاینہ ہوتا ہے۔

ان مباحث میں ہم ایک مخصوص نوعیت کے تجربہ سے دوچار ہوتے ہیں، یہاں مختلف اسباب و محرکات ہیں جو عقل کی حدود سے آگاہ کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ ہر مسئلہ کا معروف منطقی معیار کے

مطابق تجزیہ کرنا دشوار ہے۔ غیبی حقیقتوں کو روایتی منطق کا سہارا لے کر خالص عقلی اصولوں پر جانچنا ایک جرم عظیم ہے، کیوں کہ زندگی کی پیچیدگیاں اور روح کی تاثیرات ایسی نہیں جن کو انسانی جسم کی طرح جانچا پرکھا جا سکے۔

دین، غیب اور روح سیرت طیبہ کے خمیر ہیں، ان کے بارے میں حواس انسانی یا عقل محض ایک حد تک ہی اپنی رائے دے سکتے ہیں، ورنہ ان کے اکثر گوشے عقل و منطق کے تجزیہ اور حواس انسانی کی گرفت سے بالاتر ہیں، اس لیے یہ مستشرقین خواہ بظاہر مورخانہ اصول و ضوابط کے کتنے ہی پابند ہوں مگر سیرت طیبہ کے معاملہ میں ان کے افکار کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں دو نکتوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔

ایک مستشرق اپنی مغربیت اور اپنے خارجی تصور کی وجہ سے سیرت کے مزاج و فطرت میں شکست و ریخت کے عمل کو اپناتا ہے۔ اور اس طرح مذہبی جذبات سے تصادم مول لے کر ثابت شدہ حقیقتوں سے متعلق آشفتہ بیانی سے کام لیتا ہے۔ وہ اپنے وضع کردہ اصولوں اور عقلی ضابطوں کی روشنی میں سیرت کے جسم سے اس کی روح اور معنویت کو جدا کرنے کی بے سود کوشش کرتا ہے گویا کہ یہ بھی کوئی مادی جسم ہے، جس پر تجربات کرنے کے لیے بحث و جدال کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا ضروری ہو۔

مذکورہ بالا دونوں نکتوں کی روشنی میں کسی بھی مستشرق کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے بارے میں خالص اسلامی طرز عمل کوئی سنجیدہ موقف اختیار کر سکے۔

سیرت کے موضوع کو سنجیدگی سے سمجھنے کے لیے جن باتوں کی ضرورت ہے، اس کی بنیاد تین مرحلوں پر ہے، پہلے بنیادی مرحلے میں اس غیبی سرچشمہ پر ایمان یا کم از کم اس کا احترام ضروری ہے جس سے پیام محمدیؐ اور حقیقت وحی کا تعلق ہے۔

دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ موضوع کے دائرہ میں رہکر اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہیں ایسا نہ ہو کہ کسی پیشگی فیصلہ یا تصور کی وجہ سے فہم کی راہ میں جو موانع پیش آئیں ان کی روشنی میں اصل موضوع ہی کے اجزاء میں کتربیونت ہونے لگے۔

تیسرا مرحلہ خالص اصولی طریق بحث کا ہے، جس میں تحقیق کے تمام وسائل کا احاطہ کرلیا جائے تو زبان سے واقفیت اور بنیادی مواد کی فراہمی سے تحقیق کی ابتدا ہوتی ہے، اور تقابل اور موازنہ اور تنقید اور ترکیب وغیرہ پر تحقیق اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

اہل مغرب اصول تحقیق کے تیسرے مرحلہ میں تو پختگی اور کمال کی آخری سرحدوں پر نظر آتے ہیں، لیکن وہ سیرت کے موضوع پر صحیح علمی کارنامے انجام نہیں دے سکے، وہ اس موضوع کو پورے طور پر سمجھ بھی نہیں سکے کیونکہ غیبی سرچشمہ کا احترام اور موضوع کے دائرہ میں محدود رہنے کے لئے خالص علمی طرز سے ہم آہنگ ہونا ضروری تھا، اور ان کے یہاں یہی چیز مفقود ہے۔

تحقیق کے اولین مرحلہ کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اہل مغرب خصوصاً نصاریٰ اور مادہ پرستوں سے ایمان راسخ کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا، یہ ان کے لئے ممکن نہیں، لیکن چونکہ سیرت کے واقعات غیبی پس منظر رکھتے ہیں، ایک آسمانی مذہب جو بالاتر قوت سے تعلق رکھتا ہو اور وہ انسان کے زمینی یا مادی تجربوں کا نتیجہ نہ ہو، اس کو سمجھنے کے لیے اس کے حقیقی سرچشمہ کا ادراک بھی ضروری ہے۔

دوسرا مرحلہ وہ ہے کہ جس میں مغربی محقق پر یہ گرفت کی جاسکتی ہے کہ وہ بار بار اپنے موضوع سے ہٹ جاتا ہے، اگر وہ اس کا پابند ہوتا، زمان و مکان، مسلک اور نفسیاتی پیچیدگیوں سے اپنی عقل کو آزاد کرلیتا، ان اضافی رجحانات اور اصل موضوع میں کتربیونت سے اپنے آپ کو محفوظ کرلیتا تو یقیناً اس کی یہ تحقیقات سیرت کی روح اور اس کے مزاج سے

زیادہ قریب ہوتیں، اور ان میں پختگی بھی زیادہ پائی جاتی۔

مغربی مورخ یا مستشرق کا طرز تحقیق سیرت کے واقعات اور اسکی فطری ترتیب کو پورے طور پر سمجھنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے، مستشرقین نے اگر سیرت کے موضوع پر کوئی کام کیا ہے تو اس میں ان سے تاریخی جزئیات یا عقائد کی تفصیلات پر بحث و گفتگو بے فائدہ ہے، ان پر تنقید وقتی فائدہ کی حامل ہوسکتی ہے، اس لیے ان کے مقابلہ میں جزئیات کو زیر بحث لانے کے بجائے ان بنیادی امور پر گفتگو کرنی چاہئے جن سے وہ شک و ریب کے خارزار تک پہنچے ہیں۔

اب وقت آگیا ہے کہ سیرت کے موضوع پر ایک ایسا عادلانہ طریق بحث و نظر اختیار کیا جائے جس میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہو کہ ایک نبی کی سیرت دوسرے انسانی افراد کی سوانح سے واضح طور پر مختلف اور جداگانہ چیز ہے۔

یہ مستشرقین اگر سیکولر اور مادہ پرست ہیں تو غیب پر ان کا ایمان نہیں ہے، اور اگر یہودی ہیں تو ان کو اپنی نسل سے باہر کوئی نبی تسلیم نہیں، اور اگر عیسائی ہیں تو ان کو اپنے بعد کسی کی نبوت و رسالت کا یقین نہیں ہوتا۔

سیرت طیبہ نے غیب و شہود کی یکجائی کے ساتھ اسلامی عقیدہ کے اثر و نفوذ میں ایک تاریخی کردار ادا کیا ہے، اس نے تحریف شدہ مسیحیت کی راہیں مسدود کردیں، جس کی وجہ سے سیرت اور مستشرقین کے درمیان حد فاصل قائم ہوگئی، اور وہ فہم سیرت سے محروم ہوگئے، وہ بار بار اپنی غیر جانب داری اور معروضیت کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر اپنے منطقی تجزیہ اور معلومات کی کثرت کے باوجود ان کی تحقیقات کو صف اول میں جگہ نہیں دی جاسکتی، ان میں سے کچھ لوگوں کے کاموں کو دوسری تیسری بلکہ شاید دسویں صف میں جگہ دی جائے۔

ایک مستشرق لامانس کی طرح تعصب کا شکار رہو یا ہندلی چوزی کی طرح کائنات اور

زندگی کے بارہ میں مادی تصورات رکھتا ہو، ان کی تحریروں کو تحقیق کا نام دیا جانا ممکن نہیں ہے، ان کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ مغرب کی تنقیدی عقل کو تجربہ کے لیے ایک میدان فراہم کر دیا جائے، کوئی سنجیدہ مسلمان اپنے عقیدہ کو ان کی زد میں لانا پسند نہیں کریگا۔

مستشرقین کی تحقیقات شائع ہوتی رہتی ہیں، ان میں تاریخی تحقیق کے ضمن میں سیرت کے مختلف گوشوں پر بحث کی جاتی ہے، اور تحقیقی اداروں اور مختلف اکاڈمیوں میں انکے وقار اور وزن کو محسوس کیا جاتا ہے، ان میں کچھ تحقیقات وہ ہیں جن میں فہم سیرت کے لئے جدید وسائل سے کام لیا گیا ہے، اس لئے ان میں طریق بحث معتبر اور پسندیدہ نہ ہو تب بھی مطالعۂ سیرت کے وقت ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، مستشرقین کی واضح یا پس پردہ غلطیوں کی نشاندہی اور ان کے منحرفانہ انداز تحقیق کو نمایاں کرنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ ہم ان کا تنقیدی مطالعہ کریں۔

منٹگمری واٹ نے اس بات کی بڑی حد تک کوشش کی ہے کہ وہ اپنے پیشرو اور معاصر محققین کی غلطیوں سے بچکر ایک نئے محقق کی طرح سامنے آئے بلکہ اس نے اپنے دور کے مصنفین کے مقابلہ میں پہلی بار یہ التزام کیا ہے کہ سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات وحقائق کے پس پردہ غیبی بنیادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے احترام اور غیر جانب داری کو برقرار رکھے، چنانچہ وہ اپنی کتاب محمد ایٹ مکہ کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ

"میں نے ان فقہی مسائل میں جو مسیحیت اور اسلام کے درمیان چھڑ گئے ہیں، ایک غیر جانبدارانہ موقف اختیار کرنے کی کوشش کی ہے، اسی طرح یہ جاننے کے لیے کہ قرآن کلام اللہ ہے یا کلام رسول نہیں ہے، میں نے ہر بار قرآن سے دلیل پیش کرتے ہوئے "ارشاد الٰہی ہے"، "یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں" کے الفاظ سے احتراز کیا ہے، میں سادہ طور پر صرف اتنا کہوں گا کہ "قرآن کہتا ہے"...... اور اپنے مسلمان قارئین کے لیے ایسے ہی ملتے جلتے الفاظ ادا کر دوں گا۔ مغرب میں تاریخ کے جن اصولوں پر اعتماد کیا جاتا ہے، ان کی صحت اور افادیت کے حق میں مخلص ہونے کے باوجود میں نے اس پابندی کو قبول کر لیا ہے کہ امکانی حد تک کوئی ایسی بات نہیں کہوں گا، جو اسلام کے بنیادی عقیدوں سے متصادم ہو۔"

مشہور برطانوی مستشرق سر ہملٹن گب نے واٹ کی کتاب پر رائے دیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ

"یہ کتاب اپنے قاری کے ذہن میں یہ شعور پیدا کرتی ہے کہ اس کا مؤلف ایک ایسا شخص ہے جس نے کسی بھی سابق مؤلف سے بڑھکر اپنے فکر وخیال میں مکہ میں محمد کے تجربہ کے ساتھ وقت گزارا ہے، مزید برآں تحقیقی معلومات میں دقیق ترتیب اور ہم آہنگی ہے، جس کی وجہ سے یہ کتاب اصول اسلام کے مطالعہ کے سلسلہ میں ایک جدید اور قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس کتاب نے اقتصادی واجتماعی صورت حال اور قرآن کے مذہبی افکار سے ان کے تعلق کو خاص طور پر اپنا موضوع بنایا ہے۔ اور اسی لیے یہ توقع ہے کہ مغرب میں گزشتہ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں اس عظیم قائد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حق شناسی کے سلسلہ میں یہ کتاب زیادہ مؤثر ہوگی۔"[1]

منٹگمری واٹ کی کتاب کو مطالعہ وتجزیہ کے لیے منتخب کرنے کی وجہ یہی ہے کہ دوسرے مستشرقین سنجیدہ تحقیق سے دور رہے، ان کی کتابیں لائق اعتنا نہ تھیں، تاہم گزشتہ دہائیوں میں ان پر بہت زیادہ تنقیدیں کی جا چکی ہیں،

---

[1] دیکھئے محمد ایٹ مکہ کے ٹائٹل پیج پر گب کی رائے۔

واٹ نے سیرت پر دو کتابیں لکھی ہیں، لیکن میں نے دونوں کتابوں کو اپنے تجزیہ اور تنقید کا موضوع نہیں بنایا، ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس طرح بہت سی باتوں کی تکرار ہو جاتی، چونکہ دونوں کتابوں کا انداز تحقیق ایک ہے، اس طریق تحقیق کا نقص بھی ایک ہی ہے، جو دونوں کتابوں میں پایا جاتا ہے، اس لیے اس کتاب کا جائزہ لینے کے بعد یہ ضرورت باقی نہیں رہتی کہ دوسری کتاب کو بھی اپنا موضوع بنایا جائے۔

واٹ نے اپنی کتاب محمدؐ ایٹ مکہ کے مقدمہ میں جس خواہش کا اظہار کیا ہے، کیا وہ پوری ہو سکی ہے؟ اس کا جواب دینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تحریک استشراق کی تاریخ کا جائزہ لیں، اور یہ دیکھیں کہ مختلف مراحل میں اس کی کیا کیا خصوصیات رہی ہیں، اس کے جائزہ کے بعد ہی ہمیں صحیح طور پر یہ اندازہ ہو سکے گا کہ اس تحریک میں منٹگمری واٹ کی کیا حقیقت ہے، اور اس کا انداز تحقیق کس قدر جداگانہ ہے۔؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں اہل مغرب کے موقف کا تعین مذہبی اغراض کے لیے ہوا تھا، اس میں ان کے یہاں تعصب کبیدگی، نفرت اور غصہ کے جذبات کارفرما تھے، ناواقفیت نے کہیں دانستہ اور کہیں نادانستہ طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور ان کے درمیان ایسے دبیز پردے ڈال دیئے تھے، جن کی وجہ سے خالص علمی و تاریخی یا معروضی تحقیقات وجود میں نہیں آسکیں، نصرانی کلیسا کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے ان کے مذہبی نمایندوں نے ایک بے پناہ سیلاب کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی، اس کے بعد یہی کام ان کے سیکولر افراد نے انجام دیا، ان کا کلیسا سے کوئی تعلق نہیں، مگر نفرت اور تعصب کی گذشتہ روایت آج تک برقرار ہے،

ان لوگوں کے خیالات ہمارے لیے خوشگوار نہیں، مگر نقل کفر کفر نہ باشد۔ ہم قریبی دور کے چند لوگوں کے خیالات پیش کرتے ہیں، ان میں سے کچھ لوگ تو ابھی زندہ ہیں، لیکن ہم یہاں تنقید کی غرض سے اختصار سے کام لیں گے۔

مونیس نیورکورٹی اپنی کتاب "دین حق کی جستجو" میں لکھتا ہے کہ

"مشرق میں ایک نیا دشمن ظاہر ہوا یعنی اسلام جس کی بنیاد طاقت اور سخت ترین تعصب پر رکھی گئی تھی، محمدؐ نے اپنے پیرووں کو تلوار دی، انھوں نے مقدس، خلاقی روایات کے بارہ میں نرمی برتی اور اپنے متبعین کو بدی اور لوٹ کی اجازت دی، جنگ میں ہلاک ہونے والوں سے جنت میں دائمی لطف و لذت کے وعدے کیے، کچھ ہی عرصہ میں ایشیائے کوچک، افریقہ اور اسپین ان کا شکار ہو گئے، اٹلی تک کو خطرہ ہو گیا، اس آندھی نے آدھے فرانس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، شہر پر آفت آچکی تھی۔ . . . . . پھر دیکھو نصرانیت نے شارل مارٹل کی تلوار کے ذریعہ بواتیہ کے نزدیک (۷۳۲ء)، فتوحات اسلام کی راہ روک دی، تقریباً دو صدیوں (۱۰۹۹ء۔ ۱۲۵۴ء) تک مذہب کے لیے یہ صلیبی جنگ جاری رہی، یورپ مسلح ہو گیا۔ نصرانیت نجات پا گئی، اور صلیبی علم کے سامنے ہلالی پرچم سرنگوں ہو گیا، انجیل کو قرآن اور اس کے عام اخلاقی اصولوں پر فتح حاصل ہوئی[1]"

---

[1] ان اقتباسات کے لیے ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر محمد البہی :۔ الفکر الاسلامی الحدیث ص ۵۰۰-۵۲۱۔ محمد اسد لیوپولڈ ویس :۔ الاسلام علی مفترق الطرق۔ ص ۱۶، عمر فروخ و مصطفی خالدی۔ التبشیر والاستعمار فی البلاد العربیہ، توفیق الحکیم :۔ تحت شمس الفکر ص ۸، مجلۃ البلاغ کویت عدد ۵۰ ص ۱۲، مجلۃ البعث الاسلامی ہند عدد ۹ سال ۸،

موسیو کیمون اپنی کتاب "اسلام کی میتھالوجی" میں یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ

"محمدؐ کا مذہب ایک کوڑھ ہے، جو لوگوں میں پھیلا اور ان کو تباہ کرتا چلا گیا، یہ خوفناک مرض، ایک عمومی فالج اور دماغی پاگل پن ہے جو انسان کو کم تاہی اور سست روی پر آمادہ کرتا ہے، اور ان میں صرف خون ریزی ہی کے لیے بیداری لاتا ہے، مے نوشی کی عادت میں پختگی پیدا کرتا اور برائیوں پر جماتا ہے، مکہ میں محمدؐ کی قبر، گویا بجلی کی ایک لہر ہے، جو مسلمانوں کے سروں میں جنون پھیلاتی ہے اور ان کو ہسٹریا کے مظاہروں پر دماغی غفلت، لفظ اللہ اللہ کی تکرار اور بے شمار باتوں پر مجبور کر دیتی ہے، اسلام چند عادتوں کو فطرت ثانیہ بنا دیتا ہے جیسے خنزیر کے گوشت اور نبیذ اور موسیقی سے نفرت، طبیعتوں میں سختی اور تعیش کی زندگی میں بدی کو پیوست کر دیتا ہے۔"[1]

جولیان اپنی کتاب "تاریخ فرانس" میں کہتا ہے کہ

"محمدؐ مسلمانوں کے دین کے بانی ہیں انھوں نے اپنے پیروؤں کو یہ حکم دیا کہ وہ دنیا کو فتح کریں اور تمام مذاہب کی جگہ دین اسلام لے آئیں، ان میں اور بت پرستوں اور نصاریٰ میں کتنا زبردست فرق ہے، ان عربوں نے قوت کے بل پر اپنے دین کو نافذ کیا اور لوگوں سے یہ کہا کہ اسلام قبول کرو ورنہ مر جاؤ، جب کہ مسیح کے ماننے والو[ں نے]

[1] ان اقتباسات کے لیے ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر محمد البہی۔ الفکر الاسلامی الحدیث ص ۵۰۷-۵۲۱، محمد اسد لیوپولڈ ویس۔ الاسلام علی مفترق الطرق ص ۱۶، عمر فروخ و مصطفیٰ خالدی، التبشیر والاستعمار فی البلاد العربیہ، توفیق الحکیم، تحت شمس الفکر ص ۱۸، مجلہ البلاغ کویت عدد ۵۸ ص ۱۲۔ مجلۃ البعث الاسلامی ہند عدد ۹ سال ۸،

حسن سلوک اور نیکی کے ذریعہ لوگوں کو سکون بخشا، عرب ہم پر غالب آجاتے تو دنیا کا کیا حال ہوتا۔ ہاں تب تو ہم بھی الجزائر، اور مراکش والوں کی طرح کے مسلمان ہوتے،

ڈاکٹر گلڈور نے "عالمی عیسائی مشنریوں کی ترقی" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو ۱۹۶۰ء میں نیویارک سے شائع ہوئی ہے، اس کتاب کے باب چہارم کے آخر میں کچھ ذیل باتیں کہی گئی ہیں:-

"محمدؐ کی تلوار اور قرآن، تمدن، آزادی اور صداقت کے سخت ترین دشمن ہیں، اور دونوں ان تباہ کن وسائل میں سے ہیں، جن سے دنیا اب تک واقف ہوئی ہے"۔۔۔۔ قرآن سچائیوں، بے سروپا باتوں، مذہبیات اور بے بنیاد کہانیوں کا عجیب و غریب مجموعہ ہے، اس میں غلط تاریخی واقعات اور فاسد خیالات پائے جاتے ہیں، اس میں اس قدر غموض و ابہام ہے کہ کسی خاص تفسیر کے بغیر اس کو کوئی سمجھ نہیں سکتا۔۔۔۔ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ ایک ہے، بے نیاز ہے، وہ کسی کا باپ نہیں، اور نہ ہی وہ کسی کی اولاد ہے، اور یہ عقیدہ بھی ہے کہ اللہ بادشاہ ہے، زبردست ہے، غالب ہے، اس کا اپنی مخلوق اور رعایا سے کوئی رشتہ ناتا نہیں ہے، اس کے باوجود اسلام خالق اور مخلوق کے درمیان رابطہ کا بھی ذکر کرتا ہے"۔[2]

گلڈور نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے۔

[1] ان اقتباسات کے لیے ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر محمد البہی، الفکر الاسلامی الحدیث۔ ص ۵۰۷-۵۲۱۔ محمد اسد لیوپولڈ ویس، الاسلام علی مفترق الطرق ص ۱۶، عمر فروخ و مصطفیٰ خالدی التبشیر والاستعمار فی البلاد العربیہ، توفیق الحکیم، تحت شمس الفکر ص ۱۸، مجلہ البلاغ کویت عدد ۵۸ ص ۱۲ مجلۃ البعث الاسلامی ہند عدد ۹ سال ۸، [2] ایضاً۔

"محمدؐ ایک مطلق العنان حاکم تھے، وہ یہ سمجھتے تھے، کہ بادشاہ کا یہ حق ہے

کہ قوم اس کی خواہشوں کی تابعداری کرے۔ اور وہ جو چاہے کرتا رہے، ان کی

طبیعت میں یہ خیالات پیوست تھے، ان کا یہ عزم تھا کہ جو ان کی مخالفت کرے

اس کا سر قلم کر دیا جائے، ان کا عربی لشکر دھکی اور زیادتی کے لیے بے چین رہتا،

رسولؐ نے ان کو ہدایت دی تھی کہ ہر اس آدمی کو قتل کر دیں جو ان کی بات نہ

مانے یا ان سے دور رہے"[1]

سفاری نے ۱۷۳۴ء میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے، مگر اس کا خیال یہ ہے کہ

"محمدؐ نے خداوندی اقتدار کا سہارا لیا تاکہ وہ لوگوں کو اپنا معتقد بنا سکیں،

چنانچہ انھوں نے یہ مطالبہ کیا کہ ان کو رسول اللہ تسلیم کیا جائے، حالانکہ یہ عقیدہ

ان کی عقلی ضرورت نے پیدا کیا تھا"[2]

مندرجہ بالا اقوال، اسلام اور صلیبی قوتوں کے درمیان تصادم کا فطری نتیجہ تھے، صلیبی جنگوں

کے اثرات اہل مغرب کے لیے ہمیشہ تلخ رہے ہیں، چنانچہ محمد اسد (لیوپولڈ ویس) اس تجربہ کا

ذکر کرتے ہیں، جو اہل مغرب کے انداز تحقیق میں ایک مشکل اور پیچیدہ گتھی بن کر رہ گیا ہے، وہ

لکھتے ہیں کہ

"اسلام کے بارہ میں روایتی تحقیر نے گروہی عصبیت کی شکل اختیار کر لی اور

پھر دھیرے دھیرے یہ عصبیت، اہل مغرب کی علمی تحقیقات میں سرایت کر گئی، صلیبی

جنگوں کے وقت سے یورپ اور عالم اسلام میں تاریخی حالات نے جو خلیج پیدا کر دی

ہے، اس پر کوئی پل قائم نہیں کیا جا سکا، اسلام سے نفرت، یورپی فکر کا اساسی

---

[1] حوالہ سابق [2] ایضاً۔

جزو ہو گئی، دراصل ابتدائی مستشرقین وہ مسیحی مبلغین تھے جو عالم اسلام میں تبلیغی

مقاصد کے لیے کام کر رہے تھے، اسلامی تاریخ اور اسلامی تعلیمات کی جو بگڑی ہوئی شکل

انھوں نے تیار کی تھی، وہ بت پرست یورپ کے موقف میں تاثیر اور قوت پیدا کرنے

کے لیے تھی، ان کے یہاں یہ عقلی انحراف برقرار رہا حالانکہ استشراق بعد میں عیسائی

مشنریوں سے آزاد ہو چکا تھا، اور اب ان میں مذہبی جاہلیت اور اس کی حمیت باقی

نہ رہ گئی تھی، لیکن اسلام پر ان کے حملے ایک مزاجی خصوصیت اور موروثی روایت

کی طرح صلیبی جنگوں کا نتیجہ تھے، جس نے اہل یورپ کے ذہنوں میں مزید نشیب

و فراز پیدا کر دیئے تھے"[1]

دراصل صلیبی جنگوں کے علاوہ خود اسلام بھی اہل یورپ کے لیے بقول لورلیس پراؤن

ایک خطرہ تھا، چنانچہ براؤن اپنی کتاب میں جو ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی ہے لکھا ہے کہ۔

اسلام کا یہ خطرہ اس کے نظام حیات میں چھپا ہوا ہے اور اس پروپگنڈے میں

کہ اس میں پھیلنے غالب آنے اور تازہ دم رہنے کی صلاحیت ہے، یورپی سامراج

کے مقابلہ میں تنہا دہی ایک دیوار حائل ہے۔"[2]

مغربی دنیا پر اسلام کی طرف سے جو خوف طاری ہے، اس کا ایک سبب یہ ہے کہ

اسلام مکہ میں ظاہر ہوا۔ تو تعداد کے اعتبار سے اس کی قوت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اور اس کی

اشاعت بڑھتی گئی۔ اس کا ایک رکن جہاد بھی ہے، چنانچہ ایسا نہیں ہوا کہ کوئی قوم مسلمان ہونے

کے بعد پھر عیسائی ہو گئی ہو یہی بات جرمن مستشرق بیکر نے اس طرح کہی ہے کہ۔

"عیسائیت کو اسلام سے اس لیے عداوت ہے۔ کہ قرون وسطی میں اشاعت

---

[1] حوالہ سابق [2] ایضاً

اسلام نے عیسائیت کی راہ روک دی، پھر اسلام ان علاقوں میں پھیل گیا، جہاں کلیسا کا اثر و اقتدار تھا۔[1]

یورپ کا ایک دور تو وہ تھا، جب تعصب کے طوفان میں اسلام کی حقیقت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے بارے میں صحیح تعارف حاصل کرنے کا کوئی جذبہ ہی نہ تھا، اس کے بعد یورپ کے دینی افکار میں اصلاح ہوئی، روشن خیالی کا دور آیا، مذہب کو اسٹیٹ سے الگ کر دیا گیا۔ اور بیسویں صدی کے حالات آئے، اس عرصہ میں علوم اسلامیہ اور خصوصاً سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر، یورپ نے کئی نسلوں سے مسلسل کام کیا ہے، ان کو مستشرقین کہا جاتا ہے، ان میں سے ایک تعداد تو کلیسا سے وابستہ ہے، اور مذہبی لباس پہنتی ہے۔ لیکن زیادہ تر لوگ عام شہری تھے، کلیسا سے وظیفہ یاب نہ تھے، ان سے توقع تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کا لب و لہجہ کچھ نرم پڑے گا، اور آپ کی شخصیت، تاریخ اور تعلیمات کے معاملہ میں ان کے خیالات میں کچھ تبدیلی آئے گی، یہ تبدیلی آئی مگر صرف اس قدر، کہ فحش انداز اور سب و شتم کے الفاظ ترک کر دیئے گئے، کچھ تہذیب و متانت پیدا ہوگئی، لیکن تحقیق کا معیار و اسلوب اب بھی وہی رہا، جو پہلے تھا، ان کی تحقیقی خامیوں میں تین باتیں خاص طور پر نمایاں ہیں،

مستشرقین کی پہلی غلطی

شک و شبہہ پیدا کرنے میں مبالغہ سے کام لینا، بہت سی باتیں اپنی طرف سے فرض کر لینا، اپنے مخصوص ذوق اور رجحان طبع کی وجہ سے روایتوں کا انکار اور ضعیف اور شاذ روایتوں پر اعتماد، مستشرقین کا یہ وہ بنیادی وصف ہے، جو ان میں مشترک طور پر پایا جاتا ہے، وہ شک کی فضا پیدا کرتے ہوئے دور تک نکل جاتے ہیں، اور ایسی باتیں

[1] حوالہ سابق۔

فرض کر لیتے ہیں، جن کے لیے کوئی تاریخی سند موجود نہیں ہوتی، وہ اپنے مفروضہ کو بنیاد بنا کر بہت سی روایتوں کا انکار کر دیتے ہیں، اور ان کے مقابلہ میں ضعیف اور شاذ روایتوں کو تسلیم کر لیتے ہیں، چنانچہ ورمنگم نے (جو خود بھی ایک مستشرق ہے) مستشرقین کے طرز عمل پر درج ذیل تبصرہ کیا ہے۔

"واقعی یہ بات افسوسناک ہے کہ مستشرقین میں سے کچھ ماہرین تنقید میں غلو سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً موئیر، مارگولیتھ، نولدکی، اسپرنگر، ڈوزی، کیتانی، مارسین، گریم، گولڈ زیہر اور گولڈ فرواد غیرہ، ان کی کتابیں خاص طور پر تخریبی ہیں، مستشرقین جن نتائج تک پہنچے ہیں، وہ سلبی ہیں، حالانکہ سلبی انداز سے کوئی سوانح مرتب نہیں کی جا سکتی ہے، میری کتاب کا یہ مقصد نہیں ہے کہ اس کو سلسلہ وار تناقض بحثوں کا مجموعہ بنا دیا جائے۔ یہ رنج کی بات ہے کہ پادری لامانس سخت متعصب ہے، حالانکہ وہ دور جدید کے بہتر مستشرقین میں شمار کیا گیا ہے، اس نے اپنی بہتر تحقیقی کتابوں کو بھی اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ سے نفرت کی بنا پر داغدار کر دیا ہے، اس مسیحی عالم کے نزدیک حدیث اگر قرآن کے مطابق ہو تو وہ قرآن ہی سے ماخوذ سمجھی جائے گی، حالانکہ دونوں کو ایک دوسرے کا مؤید بھی قرار دیا جا سکتا تھا، مگر وہ لازمی طور پر دونوں کے توافق کو دونوں کے ناقابل اعتبار ہونے کا ثبوت قرار دیتا ہے، اس انداز کی تحقیق سے تاریخ کی کوئی کتاب کیسے لکھی جا سکتی ہے۔[1]؟

کچھ مستشرقین نے قرآن مجید کو سیرت کا ایک بنیادی ماخذ قرار دیا ہے، مگر اس طور پر کہ انھوں نے قرآن کو اپنے مقاصد کے لیے دو دھاری تلوار بنانے کی کوشش کی ہے، اس کا

[1] حیاۃ محمدؐ، مقدمہ ص ۸-۱۱،

سبی رخ تو یہ ہے، کہ انھوں نے سیرت کے ان تمام واقعات کو قلم زد کر دیا ہے، جن کا تذکرہ قرآن مجید میں نہیں ہے، گویا کہ قرآن مجید کوئی تاریخی کتاب ہے، جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح نگاری کے لیے مرتب کی گئی ہو، ان کی مذکورہ بالا تحریبی ذہنیت سیرت کے ہر ایسے واقعہ میں شک پیدا کرتی، یا اس کا انکار کر دیتی ہے، جس پر قرآن مجید میں کوئی تائیدی بیان نہ ہو، خاص طور پر اس وقت جب کہ اس واقعہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ثابت ہوتی ہو، یا اس واقعہ کا انکار کر دینے سے استشراقی رجحانات کو تقویت ملے۔ مثلاً اسپرنگر کا خیال ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی قرآن مجید کی چار سورتوں (آل عمران، احزاب محمد اور فتح) میں وارد ہوا ہے، اور یہ سورتیں مدنی ہیں، لہذا ہجرت سے پہلے رسول کے لیے محمدؐ کا لفظ علم کے طور پر نہیں تھا، عیسائیوں سے روابط پیدا ہونے اور انجیل کا مطالعہ کرنے کے بعد انھوں نے یہ نام اختیار کر لیا تھا۔[1] اسپرنگر سے ہمارا سوال یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انجیل کی وہ پیشین گوئیوں کو پڑھنے کے بعد اپنے لیے نام محمد چن لیا تو اصلی محمد جس کی عہد نامہ قدیم و جدید نے بشارت دی تھی، وہ کہاں ہے ہو۔

اس سلسلہ کی ایک اور مثال یہ ہے کہ یہودی قبیلہ بنو نضیر پر حملہ کی ایک وجہ عرب مورخین یہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شب خون مارنے کی کوشش کی تھی، لیکن اسرائیل ولفنسون بشیر کہتا ہے کہ مستشرقین مذکورہ روایت کو صحیح قرار نہیں دیتے کیونکہ اس کا سورۂ حشر کی ان آیتوں میں کوئی تذکرہ نہیں ہے، جو بنو نضیر کو جلاوطن کیے جانے کے بعد نازل ہوئی ہو۔[2]

[1] جواد علی، تاریخ العرب ج ۱ ص ۰۰، مع حواشی۔ [2] تاریخ الیہود فی بلاد العرب فی الجاہلیۃ و صدر الاسلام ص ۱۳۵ - ۱۳۰۔

روایتوں میں تشکیک یا ان کو رد کر دینے کا مذکورہ اصول، منٹگمری واٹ کے یہاں بھی زیر بحث آیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ

"ان غلطیوں کی اصلاح کے لیے جو ہمیں ماضی سے وراثت میں ملی ہیں یہ ضروری ہے کہ ہم تمام حالات میں محمدؐ کی سچائی پر سختی سے قائم رہیں، جب تک کہ اس کے خلاف کوئی دلیل قاطع نہ پائی جائے۔ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ قطعی دلیل کے لیے اس کا صرف امکان ہی کافی نہیں ہے، سیرت جیسے موضوع پر اس کا حصول کہیں زیادہ دشوار ہے"[1]

مستشرقین نے جن بے شمار واقعات کا انکار کیا ہے، ہم اس کی سیکڑوں مثالیں پیش کر سکتے ہیں، مثلاً مدینہ پر یہود کی طرف سے مختلف عرب قبائل کو حملہ پر آمادہ کرنے کا، بروکلمان نے کوئی ذکر نہیں کیا ہے، وہ غزوۂ خندق کے نازک حالات میں رسول اکرمؐ کے ساتھ بنو قریظہ کی عہد شکنی کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے، اور صرف یہ لکھتا ہے کہ

"پھر مسلمانوں نے بنو قریظہ پر حملہ کر دیا جن کا رویہ بہر حال واضح نہ تھا"[2]

اسی طرح اسرائیل ولفنسون نے غزوۂ خندق میں نعیم بن مسعودؓ کے کردار کا کوئی ذکر نہیں کیا، جس کی وجہ سے مشرکوں اور یہودیوں میں بے اعتمادی پیدا ہو گئی،[3] غالباً یہ یقین دلانے کے لیے، کہ یہود نے دھوکہ نہیں دیا،

مستشرقین ضعیف اور شاذ روایتوں پر اعتماد کرتے ہیں، جو تنقید کی کسوٹی پر بے بنیاد ثابت ہوتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر جواد علی، ان مستشرقین نے اکثر ضعیف خبروں کو قبول کرکے ان کے مطابق

[1] محمد بمکہ ص ۹۲ [2] تاریخ الشعوب الاسلامیہ ص ۵۳ - ۵۴ - [3] تاریخ الیہود فی بلاد العرب ص ۱۴۵ - ۱۴۶ -

فیصلے کیے ہیں، مشہور اور معروف روایتوں کے مقابلہ میں شاذ اور غریب روایتوں کو ترجیح دی ہے، اس روایت کو جو متاخر ہو، یا ماہرین نقد نے اس کی غرابت کا حکم دیا، اور اس کے شذوذ کا فیصلہ کیا ہے، مگر یہ مستشرقین عمداً اسی کو اختیار کرتے ہیں، کیونکہ شبہات کی فضا پیدا کرنے میں وہی ان کا ایک تنہا وسیلہ ہیں۔[1]

دوسری غلطی | تاریخی واقعات پر مصنوعی سیکولر حالات اور معاصر ماحول کا عکس ڈالنے کی کوشش کی

ایتین ڈینیہ نے صراحت کی ہے کہ مستشرقین کے لیے اپنے جذبات، ماحول اور مختلف رجحانات سے کنارہ کش ہونا مشکل بلکہ ناممکن ہے، نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے صحابہ کے حالات ہیں ان مستشرقین نے اس قدر تحریف سے کام لیا ہے کہ ان کی حقیقی تصویر نظروں سے اوجھل ہوگئی، وہ اگرچہ تنقید کے منصفانہ اسلوب اور تحقیق کے سنجیدہ علمی اصولوں کی پیروی کا دم بھرتے ہیں، لیکن ان کی تحریروں کو پڑھکر ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے، کہ اگر مؤلف جرمن ہے، تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم جرمن اسلوب میں کلام کرتے تھے، اور مؤلف اطالوی ہے، تو آپ گویا اٹلی والوں کے طرز پر گفتگو کیا کرتے، کیونکہ ہر ایسے مقالہ نگار کی شہریت تبدیل ہونے کی وجہ سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تصویر بھی بدلتی چلی جاتی ہے، چنانچہ ان تحریروں کے آئینہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی تصویر دیکھنا چاہیں تو ہمیں اس بارہ میں مایوسی ہوگی، مستشرقین ہمارے سامنے خیالی تصویر پیش کرتے ہیں، جنھیں حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، اتنا تعلق بھی نہیں جتنا ان تاریخی کہانیوں کے کرداروں سے ہے، جن کو والٹر اسکاٹ یا اسکندر دیماس وغیرہ نے ترتیب دیا ہے، کیونکہ ان لوگوں نے اپنے ہم وطنوں کے حالات تحریر کیے ہیں، جن میں صرف زمانی فرق کا لحاظ رکھنا ضروری تھا، مگر مستشرقین سیرت نبویؐ کی شخصیتوں کو ان کے حقیقی رنگ میں نہیں دیکھ سکے۔

[1] تاریخ العرب فی الاسلام - ج ۱ ص ۱۰۸-۱۱۰۔

انھوں نے اپنے مغربی خط اور عصری خیالات کی روشنی ہی میں سیرت کے افراد کو پیش کیا ہے۔

ایتین دینیہ ایک برعکس مثال دیکر اپنے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے مزید لکھتا ہے کہ

"اگر اقصائے چین کا کوئی عالم ان تضادات کا جائزہ لے جو فرانسیسی مؤرخوں کے یہاں بکثرت ملتے ہیں، اور مشرق بعید کے آئینہ میں ان کی چھان بین کرے اور کارڈینل رشیلیو کی کہانی کی ان بنیادوں کو جن سے ہم واقف ہیں ختم کردے اور رشیلیو کو ہمارے سامنے اس طرح پیش کرے جیسا ہکن نے کیا ہے، ایک کاہن کی صفات، طبیعت اور مزاج رکھنے والا رشیلیو تو یورپ والے رشیلیو کی یہ تصویر دیکھکر کیا رائے قائم کریں گے؟ واقعہ یہ ہے کہ دور جدید کے مستشرقین نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت بیان کرتے ہوئے ایسے ہی غلط نتائج اخذ کئے ہیں، ان کو پڑھکر یہ خیال ہوتا ہے، کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مستشرقین کی تحریروں میں جرمن، انگلش یا فرنچ لب ولہجہ اور محاورات میں گفتگو کرتے رہے ہوں، ہمیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ عربی زبان کے مزاج اور محاوروں کے مطابق عربوں سے ہم کلام رہے ہوں۔"

یہ فرانسیسی مستشرق ایتین دینیہ جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ آخر میں لکھتا ہے۔ کہ

"ہمارے جلیل القدر نبی کی شخصیت، اسلامی روایات کی رو سے نہایت ہی بلند اور ارفع ہے، اس مصنوعی شخصیت کے مقابلہ میں جس کی روشنی کو اہل مغرب نے اپنی درس گاہوں میں بڑی جدوجہد کے بعد کم کردیا ہے۔"[1]

کیتانی ان بڑے مستشرقین میں ہے، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ابتداء میں بہت کچھ لکھا ہے، لیکن بقول ڈاکٹر جواد علی "وہ تحقیق میں مخالفانہ طرز عمل اختیار کرتا ہے"،

[1] محمد رسول اللہؐ - مقدمہ - ص ۲۷-۲۸، ۳۳، ۴۴،

تاریخ اسلامی کے میدان میں ان جدید ماہرین فن کی طرح جو غلط بنیادوں پر اپنی تحقیق کو استوار کرتے ہیں، یہ لوگ پہلے ہی سے ایک خیال کو جنم دیتے ہیں، پھر تاریخی واقعات کی چھان بین کرتے ہیں، تاکہ اپنے نظریہ کو ثابت کر سکیں، اور دوسرے خیالات کو قریب بھی نہ آنے دیا۔ کیتانی نے تدوین سیرت کا کام کرنے سے پہلے ہی اپنا ایک نظریہ و خیال گھڑ لیا، اور پھر اس کی تائید کے لیے اپنی کتاب میں ایسی روایات درج کیں جن سے اسکو کچھ بھی مدد ملتی ہو، وہ روایات قوی ہوں یا ضعیف، اس کو اپنی رائے کو ثابت کرنے سے غرض تھی، نہ کہ اس بات سے کہ وہ روایت ضعیف ہے، بلکہ وہ ضعیف روایتوں کی توثیق کرتا، اور ان کو حجت قرار دیتا ہے۔ ان کی روشنی میں فیصلے کرتا ہے، اہل علم کے یہاں صحیح اور غلط روایتوں کے جو سلسلے مشہور رہے، ان کو وہ جانتا ہوگا، لیکن ضعیف روایتوں کو قبول کرتے ہوئے وہ علماء کے خیالات سے صرف نظر کر لیتا ہے، اس نے چونکہ پہلے سے ایک خیال اپنے دل و دماغ میں پیدا کر لیا ہے اس لیے ہر طرح اسی کو ثابت کرنے پر تلا ہوا نظر آتا ہے، وہ اگر بحث کے جدید طریقوں کے مطابق ان روایتوں پر نقد و جرح سے کام لیتا تو اپنے مزعومہ خیالات کو ثابت کرنا اور انھیں درج کتاب کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا۔[۲]

اتین دینیہ نے اپنی کتاب "اشرق کما یراہ الغرب" کے آخر میں مذکورہ طرز تحقیق پر کچھ اور افکار بھی شامل کر دیے ہیں، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

"ڈاکٹر ہیرگرنج نے صحیح لکھا ہے کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جدید سوانح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ تاریخی تحقیقات بے اثر اور بے نتیجہ ہیں، جن کو کسی خاص نظریہ یا پیشگی تصورات کا تابع بنا دیا جائے" یہ بات اس زمانہ کے مستشرقین کو پیش نظر

۲؎ تاریخ العرب فی الاسلام۔ ج ۱، ص ۹۵

رکھنی چاہیے، تاکہ وہ گزشتہ طرز عمل کی ان بیماریوں سے محفوظ رہیں، جن میں ساری توانائی صرف کرنے کے بعد بھی ان کی رسائی غلط نتائج ہی تک ہو پاتی ہے، وہ کسی خیال کی تائید کے لیے پہلے تو کچھ واقعات کی تردید کرتے ہیں، جو کہ آسان نہیں، پھر ان سے پیدا ہونے والے خلا کو پر کرنے کے لیے ایسی نئی نئی باتیں پیدا کرتے ہیں، جو ناممکن ہوں، بیسویں صدی میں دنیائے علم کو اصل حقائق تک رسائی کے لیے چند بنیادی اسباب و عوامل سے واقف ہونا ضروری ہے، مثلاً زمانہ، ماحول، علاقہ، رسوم و روایات، ضرورتیں، رجحانات اور حوصلہ مندانہ جذبات وغیرہ۔ خاص طور پر ان داخلی صلاحیتوں اور قوتوں کا علم بھی ضروری ہے، جن کو منطق کے پیمانہ سے ناپا نہیں جا سکتا، مگر انھیں سے متاثر ہو کر مختلف افراد اور گروہ عمل کے میدان میں رواں دواں ہوتے ہیں۔[۱]

مزید براں، مصنوعی سیکولر کردار اور اس مخصوص نقطۂ نظر کی وجہ سے جس نے ہماری تاریخ کے بارے میں مغربی رویہ کو متاثر کیا ہے، مستشرقین ایک اور غلطی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ بات ہرگز نہ تھی کہ رسول اللہؐ کو اپنے اقدامات کے ممکن نتائج کا پہلے سے علم رہتا ہو، بلکہ وہ اپنے سامنے کے حالات، اور ان کے تقاضوں ہی کو دیکھکر اپنی دلچسپیوں کے کاموں کا انتخاب کر لیا کرتے تھے، چنانچہ اس دعوی کا ایک نمایاں ثبوت غالباً وہ بحث ہے جو فلہاوزن اور اس کے رفقاء کار نے چھیڑ رکھی ہے۔ وہ مکی دور میں تحریک اسلامی کے مقامی اثرات کا جائزہ لیکر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ چونکہ اسلام ابھی مدنی دور میں داخل نہیں ہوا تھا، جو اسلام کی بین اقوامی دعوت و تحریک کا زمانہ ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حالات کے

۱؎ محمد رسول اللہؐ۔ مقدمہ ۴۳ - ۴۴۔

بارے میں بھی نہیں سوچا تھا، جو ابھی تک پردۂ خفا میں تھے، ان کے خیال میں رسول اللہؐ نے مکی دور میں عدم تشدد کا طریقہ اختیار کیا تھا، لیکن جب مدینہ میں منتقل ہو کر انھوں نے حکومت قائم کرلی، اور ان کے ارد گرد جنگباز اکٹھا ہوگئے تو ان کے اسلوب میں سختی اور طاقت آگئی،

فلہاوزن کا خیال یہ ہے، کہ محمدؐ اپنے عقیدہ کے ذریعہ خونی رشتہ کے حصار سے نکل کر اپنے معتقدین کے حلقہ کو وسیع کر سکتے تھے، کیونکہ خونی رشتہ عصبیت اور تنگی کا رشتہ تھا، جس میں دوسروں کے لئے کوئی کشش نہ تھی، لیکن اس رشتہ کو نظر انداز کر کے خالص دینی رشتہ کی وسعتوں کا محمدؐ کو اندازہ نہ تھا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ایک طبقہ جو اس رشتہ سے وابستہ نہ تھا، اس کو محمدؐ اپنے قریب نہ کر سکے[1]

فلہاوزن کے نظریہ کو سرٹامس آرنلڈ نے اپنی کتاب "دعوت اسلام" میں غلط قرار دیکر نظر انداز کر دیا ہے، اور لکھا ہے کہ

"یہ ایک عجیب بات ہے، کہ کچھ مورخوں نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ ابتدا میں دین اسلام کے عالمی ہونے کا تخیل، پیغمبر اسلام کے ذہن میں نہ تھا، حالانکہ قرآن مجید کی متعدد آیات اس دعویٰ کی تردید کرتی ہیں"[2]

(باقی)

---

[1] الدولۃ العربیۃ وسقوطہا، ص ۴ [2] آرنلڈ نے حسب ذیل آیتوں سے استدلال کیا ہے، سورۃ ۳۶ آیت ۶۹ - ۷۰، سورہ ۲۱ آیت ۱۰۷، سورہ ۲۵ آیت ۱، سورہ ۲۲ آیت ۷، سورہ ۹۱ آیت ۹۔

کشمیر میں اسلامی ثقافت کے تاریخی مراحل

از

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری گورنمنٹ ڈگری کالج نوا کدل، سرینگر کشمیر،

کشمیر میں اسلام اس کی ملحقہ ریاستوں کے مقابلے میں بڑی دیر کے بعد داخل ہوا، تاہم جونہی یہاں اسلام اور اسلامی علوم و افکار کی اشاعت ہوئی تو کشمیر بہت جلد ایک اہم علمی اور فکری مرکز بن گیا، یہاں کی درسگاہوں میں خراسان اور عراق کے طلبۂ علم داخل ہو کر وقت کے اکابر علماء سے فیض حاصل کرتے تھے، پچھلے چھ سو سال کے دوران کشمیر میں نہ صرف دینی علوم کے متبحر عالم پیدا ہوئے، بلکہ عقلی اور ادبی علوم و فنون نیز طب، تاریخ اور تصوف کے بہت سے برگزیدہ علماء بھی منصۂ شہود پر آئے انھوں نے اپنے اپنے زمانے میں ماہرین فن کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی، وہ غیر منقسم ہندوستان کی اسلامی فکر و ثقافت کی تاریخ میں اپنے لیے مخصوص جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے، زیر نظر مضمون میں اسی تاریخی حقیقت کو مستند ماخذ کے ذریعہ سے پیش کرنا ہے۔ مگر اصل موضوع کی طرف آنے سے پہلے کشمیر کی قدیم فکری و ادبی حالت پر بھی سرسری نظر ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اسلام کی اشاعت سے پہلے کشمیر کا علمی اور فکری مقام

کشمیر اس لحاظ سے بھی خوش قسمت ہے کہ یہ قدیم زمانے میں بھی علم و فکر اور ادب و ثقافت کا ممتاز مرکز رہا ہے، بدھ اور ہندو دور حکومت میں یہاں کے اہل علم نے عقلی اور ادبی فنون میں اپنی بصیرت اور صلاحیت کے ایسے نقوش آس پاس کے

ملکوں پر ثبت کیے تھے کہ دیومالائی قصّے کہانیوں پر یقین رکھنے والوں کا یہ ایک مستقل عقیدہ تھا کہ علم کی دیوی سرسوتی کشمیر ہی میں قیام کرتی ہے[1]، اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی نقل کیا جاتا ہے کہ راجہ کنیشک نے جب اپنے درباری شاعر ہرش کو سنسکرت میں کوئی غیر معمولی تصنیف پیش کرنے کا حکم دیا تو اس نے کافی محنت کے بعد اپنی وہ مشہور کتاب تالیف کی جو سنسکرت شعر و ادب میں "نے شدھ" سے جانی جاتی ہے، مگر راجہ نے مطالعہ کرنے سے پہلے کہا کہ پہلے اسے کشمیر لے جاؤ، وہاں کے پنڈتوں کو دکھاؤ، علم کی دیوی کے سامنے رکھو اور اس کے بعد مجھے ان تجربات سے آگاہ کرو[2]۔ ابو ریحان البیرونی رحمۃ اللہ علیہ جب سلطان محمود غزنوی کے ساتھ کشمیر کے حدود تک پہنچا، اور یہاں کشمیر کے بارے میں معلومات اکٹھے کیے، تو اسے یہاں . . . . کی علمی رونق پر بڑا تعجب ہوا تھا، اس نے اپنے معلومات پوری دیانت سے اپنی مشہور کتاب تحقیق ما للہند[3] . . . میں قلمبند کیے، اسی کتاب میں اس نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ویدوں کو سب سے پہلے کشمیر ہی کے پنڈت ضبطِ تحریر میں لائے، جب کہ اس سے قبل ویدوں کا وجود ان کے یاد کرنے والوں کے حافظے تک محدود تھا، اس نے یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ "ہندوستان میں کشمیر اور وارانسی علم و فکر کے دو اہم ترین مرکز ہیں"۔

البیرونی سے صدہا سال قبل ہندوستان اور چین کے تشنگانِ علم کشمیر وارد ہو کر سیراب ہوتے تھے، انہی میں مشہور چینی سیاح ہیون سانگ بھی شامل تھا، اس کے آنے پر معاصر کشمیری حکمراں درلابھ وردھن نے بذاتِ خود اس کا استقبال کیا، وہ بارہمولہ کے راستے سے داخل ہوا، اور یہاں دو سال قیام کر کے پیر پنچال کے راستے سے وطن واپس لوٹا، اس مدت کے دوران اس نے

Contribution of Kashmir to Sanskrit &
(V1) " " Literature: K.S. Nagran, P.IV

[3] کتاب کا پورا نام ہے تحقیق ما للہند من مقولۃ، مقبولۃ فی العقل او مرذولۃ

کشمیر کے بیس[1] پنڈتوں کی رہنمائی میں شاستروں کا مطالعہ کیا، چینی سیاح نے ان پنڈتوں کی علمی صلاحیتوں کی بے حد تعریف کی ہے، جب وہ واپس لوٹا تو کشمیر سے اپنے ساتھ قیمتی کتبے اور نوشتے لے گیا تھا، جن کے ترجمے اس نے چینی زبان میں کیے، کہتے ہیں کہ اسی کی کوششوں سے چین میں بدھ مت پھیلنے میں سرعت واقع ہوئی تھی[2]۔

جس طرح کشمیر میں اسلامی علوم و ثقافت کی ترویج و اشاعت مذہب کے طفیل ممکن ہو سکی، اسی طرح بدھ اور ہندو مذہب کے راستے ہی یہاں سنسکرت علوم کو عروج حاصل ہوا تھا، قدیم ترین زمانے میں جب ہندوستان میں سانپ پوجا کا عقیدہ زوروں پر تھا تو کشمیر بھی اس کا اہم مرکز بن گیا تھا[3]، جب یہاں بدھ مت کی اشاعت ہوئی تو بہت جلد بدھ فکر و ثقافت کا بھی گہوارہ سمجھا جانے لگا، جس میں مہاراجہ اشوک اور کنشک کی ذاتی کوششوں کا بھی بڑا دخل تھا، کنشک نے دوسری عالمی بدھسٹ کانفرنس کشمیر ہی میں منعقد کی تھی، اور یہ اپنی نوعیت کا آخری اجتماع تھا، پورے اٹھارہ سو (۱۸۰۰) سال بعد ۱۹۵۶ء میں برما کے سابق سربراہِ مملکت "یو نو" نے گوتم بدھ کے یومِ ولادت کے موقع پر ایسا ہی شاندار اجتماع منعقد کر کے پرانی یاد تازہ کی۔

غرض اشوک اور کنشک کے علاوہ راجہ جلوک، راجہ ہسکا اور راجہ جبکا جیسے نامور کشمیری حکمرانوں نے بھی کشمیر میں بدھ مت کی غیر معمولی سرپرستی کی، انھوں نے بدھ فکر و فلسفہ کی تیز ترقی اور اشاعت کے لیے جگہ جگہ وہار تعمیر کیے۔

ایک مدت گزرنے کے بعد کشمیر میں بھی بدھ مت مغلوب ہوا، اور اس کی جگہ ہندو فکر و فلسفے نے

---

[1] ملاحظہ ہو مذکورۂ بالا انگریزی تصنیف۔ ص ۱۱، [2] چین کا یہ سیاح آج اپنے ملک میں Xuan Zhuang سے جانا جاتا ہے، یہاں (Xi.an) صوبے میں اس کے نام پر مخروطی شکل کی ایک مذہبی عمارت بطور یادگار موجود ہے جو ۶۰ میٹر لمبی اور سات منزل اونچی ہے [3] ارلی ہسٹری اینڈ کلچر آف کشمیر: از ایس۔ سی۔ رائے۔ ص ۱۴۰

سنبھال لی۔ اب شیو اور وشنو کی پرستش ہر طرف پھیل گئی۔ اسے بھی بعض حکمرانوں کی کھلی سرپرستی
حاصل ہوئی۔ بالخصوص کرکوٹ خاندان کے جملہ حکمرانوں اور اُتپال خاندان کے راجہ اونتی ورمن
(۸۵۵ء تا ۸۸۳ء) نے ہندو دھرم کی ترویج و اشاعت میں پورا زور صرف کیا، آخر میں
بدھمت اور ہندو دھرم کے درمیان بڑے پیمانے پر فکری تصادم رونما ہوا، جس سے یہاں
کے اہل علم کو اپنی ذہنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کا موقعہ مل گیا، ہندو عالموں نے اپنی انہی
صلاحیتوں کے بل پر ایک علٰحدہ فلسفہ مرتب کیا، جو کشمیری شیو ازم کہلاتا ہے، یہ فلسفہ بہت
جلد اتنا مقبول ہوا کہ سنسکرت شعر و ادب میں اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں اس سلسلہ میں
کشمیر میں چند ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے اپنے دور میں دور دور تک شہرت حاصل کی
ان میں اُتپل، ابھی نوگپت، کلاٹ، داسوگپت، سوم آنند وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

فلسفہ اور الٰہیات کے دوش بدوش کشمیر میں سنسکرت شعر و شاعری اور بلاغت (النکار) کی
ترقی بھی وسیع پیمانے پر ہوئی، اس کے سرپرستوں یہاں شعرا اور اہل علم نے کمیت اور کیفیت میں بڑی
وسعت بخشی۔ بزاز لکھتے ہیں۔ اگر کشمیر کے شعراء نے شعر کے دوسرے اصناف کی جانب کوئی
توجہ نہ بھی کی ہوتی تب بھی انھوں نے تاریخ نویسی اور فحش نگاری میں جو کمال حاصل کیا ہے، وہ
ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا،[1] کلہن پنڈت کی مشہور تاریخ کشمیر راج ترنگنی منظوم سنسکرت
ہی میں ہے،

مسلمانوں کی طرف اقتدار کی منتقلی | چودھویں صدی عیسوی میں کشمیر میں مسلمان موجود تھے، بلکہ
اس کے سرحدی علاقوں پر کافی مدت سے مسلمان آباد ہو چکے تھے، اسی طرح کشمیر کے بعض ہندو
حکمرانوں کی بدولت مسلمانوں کی یہاں آمد و رفت رہتی تھی، جس پر برہمن مورخ پنڈت کلہن نے

[1] کلچرل ہیری ٹیج از۔ اس۔ سی۔ بزاز۔ ص ۲۰۸

اپنی سخت ناراضگی کا اظہار بھی کیا ہے، وہ بالخصوص کشمیری حکمران ہرش کو اس کی بدلتی ہوئی
زندگی پر برہم ہو کر اُسے نیم مسلمان (ترکشا اور ملیچھ) ٹھہراتا ہے، اس حکمران نے اپنے دور حکومت
میں کئی مندروں کو مسمار کیا تھا، جس کا کلہن اور دوسرے قدیم و جدید مورخ اعتراف کرتے ہیں،
صوفیہ، مبلغ اور تاجر بھی یہاں آتے رہے، ان کی کوششوں سے بھی کشمیر میں اسلام داخل ہوا، اور
یہاں مسلمان مقیم ہونے لگے، تاہم ان کا وجود برائے نام ہی تھا، اور وہ ابھی اپنا مذہبی اور ثقافتی
تشخص برقرار رکھنے کے اہل نہیں تھے، دوسری طرف چودھویں صدی کی ابتدا ہی سے کشمیر کے
اندرونی حالات بڑی تیزی سے بگڑ رہے تھے، یہاں تک کہ قلیل مدت کے اندر حکمران تو رنگم،
اہل مناصب رسوائے زمانہ ظالم، اور رشوت خور تاجر بے رحم و بددیانت، اور مذہبی و علمی . . .
کھوکھلا نظر آنے لگا، ملک میں طوائف الملوکی عام ہو گئی، اور طبقہ وارانہ نے پورے کشمیر کو
اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ انہی حالات میں ایک منگول حملہ آور ذوالجو نے کشمیر پر دھاوا بول دیا،
اور یہاں چھ ماہ تک خونریزی، غارتگری اور آتش زنی سے قیامت برپا کی، کشمیر حکمران سہہ دیو کو
بھاگ گیا، اور بکھرا انتظام اس کے قابل اعتماد ملازم رام چندر نے سنبھالا اس وقت فوج اور انتظامیہ میں کچھ
طالع آزما داخل ہو چکے تھے، جنہیں تبت کا ایک بودھ ریچن اور سوادگبر کا ایک مسلمان شاہ مرزا بڑی ہوشیاری سے مناسب وقت
کا انتظار کر رہے تھے، ریچن نے تبت کے کچھ تاجروں کے ذریعہ رام چندر کو قتل کر دیا اور اسکے ساتھ کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر
اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی پھر اُسے رام چندر کی اکلوتی بیٹی، کوٹہ رانی کے مزاحم
ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا، تو اس نے کوٹہ رانی سے شادی کر کے اس خطرے کو دور کیا۔

ریچن اگرچہ موروثی طور پر بدھ مت کا پیرو تھا، مگر وہ طبعاً بدھ دھرم سے مطمئن نہیں تھا۔
اور کسی دوسرے مذہب کا متلاشی تھا، اس زمانے میں جو صوفیہ یہاں وارد ہوئے تھے ریچن نے
انہی میں سے ایک بزرگ حضرت سید شرف الدین عبد الرحمٰنؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

اور صدر الدین نام اختیار کیا، اور وہ تاریخ کشمیر کا پہلا مسلمان حکمراں ہوا۔ صدر الدین نے چار سال (۱۳۲۰ء تا ۱۳۲۳ء) حکومت کرنے کے بعد انتقال کیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کی بیوی کوٹہ رانی نے تخت و تاج سنبھالا۔ اسی اثنا میں راجہ سہہ دیو جو رینچن سے قبل کشمیر کا حکمراں تھا اور منگول حملے سے خائف ہو کر بکمال بزدلی کشتواڑ کی طرف بھاگ گیا تھا، اس کے بھائی اودن دیو نے خود بھی پکھلی کی طرف فرار کا راستہ اختیار کیا تھا، مگر اب وہ دار الحکومت وارد ہوا۔ کوٹہ رانی نے ہندو حکومت کی ڈوبتی کشتی کو سہارا دینے کی کوشش کرتے ہوئے نہ صرف اودن دیو کو تخت و تاج سونپا بلکہ خود اس کے ساتھ شادی کر لی۔ مگر اچانک ایک غارت گر پہاڑی قبیلے نے کشمیر میں دہشت اور غارت گری پھیلا دی۔ اودن دیو تبت کی طرف بھاگ گیا۔ مجبوراً کوٹہ رانی نے اپنے فوجی افسر شاہ مرزا کو کچھ اہم اختیارات دے کر یہ شورش کچلنے پر مامور کیا۔ شاہ مرزا نے کامیابی سے اس کو فرو کیا، مگر ساتھ ہی اپنے حق میں حکومت و سیادت کا فوراً اعلان کر دیا، اور سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کر لیا۔ اس کی راہ کی رکاوٹ کوٹہ رانی کی ذات تھی، مگر یہ رکاوٹ اس طرح دور ہو گئی کہ جب سلطان نے اس کا نکاح اپنے ساتھ کرنا چاہا تو کوٹہ رانی نے خود کشی کر کے شمس الدین کے لیے میدان صاف کر دیا۔

گو سلطان شمس الدین شاہ میر کو صرف تین سال اور چند مہینے (۱۳۳۹ء تا ۱۳۴۲ء) حکومت کرنے کا موقع ملا مگر یہ حکومت اس کی اولاد میں تقریباً ڈھائی سو سال تک قائم رہی، یہ حکومت تاریخ کشمیر میں شاہمیری حکومت کہلاتی ہے، اس خاندان نے کئی بلند پایہ سلاطین پیدا کئے، جن میں شہاب الدین، قطب الدین، سکندر اور زین العابدین کے نام قابل ذکر ہیں، یہ چاروں حکمراں اپنے عظیم کارناموں کے لحاظ سے ایشیا کے ممتاز حکمرانوں کی فہرست میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔

حضرت امیر سید علی ہمدانیؒ کی تشریف آوری اور کشمیر میں مذہبی اور فکری انقلاب

کشمیر میں اسلام کی منظم اشاعت کی طرف سب سے پہلے حضرت امیر کبیر سید علی ابن شہاب الدین الہمدانیؒ نے توجہ فرمائی، ان کی تشریف آوری کے وقت کشمیر میں جتنے بھی مسلمان تھے، وہ تقریباً سب کے سب صحیح اسلامی معاشرت اور دینی فکر و مزاج سے نا آشنا تھے، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہاں کی سرزمین ہزارہا سال سے بدھ مت اور ہندو دھرم کا گہوارہ تھی، اس لیے ایسے ماحول میں اسلامی معاشرے کا پروان چڑھنا یا اسلامی علوم و ثقافت کا پنپنا بڑا مشکل تھا، یہاں جو دوسرے صوفیہ اور مبلغین وارد ہوتے تھے، وہ اس تبلیغی کاوش کو خاموش دعوت اور تربیت اور درویشانہ زندگی تک محدود رکھتے تھے، یہ صرف حضرت امیرؒ کی خداداد بصیرت کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے یہاں کے حالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہی تبلیغ و اصلاح کا منصوبہ بنایا اور پھر اس پر عمل کیا، وہ وسط ایشیائی ممالک سے علماء اور اہل فن اپنے ساتھ لائے اور انھیں کشمیر میں مختلف مقامات پر تبلیغ دین، تربیت اخلاق اور ترویج ثقافت پر متعین کیا۔ وہ خاص اسی مقصد کے لیے تین مرتبہ کشمیر تشریف لائے، اور ہر بار یہاں مہینوں اور برسوں قیام کیا، اپنے انتقال سے کچھ پہلے اپنے اکلوتے فرزند حضرت میر سید محمد ہمدانیؒ کو وصیت کی تھی کہ وہ ان کے مقدس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کوئی سستی نہ برتیں، چنانچہ اس وصیت کے مطابق ان کے فرزند نے یہ سلسلہ بڑی لگن اور جانفشانی کے ساتھ آگے بڑھایا، وہ یہاں بارہ سال ٹھہرے۔ اس مدت میں مسجدوں، خانقاہوں اور درسگاہوں کی تعمیر کرائی، انھوں نے کشمیر میں دو شادیاں کی تھیں، اس طرح کشمیر سے فکری اور روحانی تعلق کے ساتھ جسمانی رشتہ بھی قائم کیا، ان کی کوششوں سے کشمیر میں اسلامی فکر و ثقافت کو وہ استحکام اور عروج حاصل ہوا جسے اولو العزم سلاطین اپنے زمانے میں نہ کر سکے، ... ایرانی محقق ڈاکٹر احسان اللہ

لکھتے ہیں :-

"شاہ ہمدان (میر سید علی ہمدانیؒ) اور ان کے رفقاء نے نہ صرف اہل کشمیر کی اسلام کی طرف کامیاب رہنمائی کی بلکہ انھیں صنعت و حرفت اور فارسی زبان و ادب سے بھی نوازا، چنانچہ کشمیر کے لوگ اپنے تمام مظاہر زندگی اور ترقی و خوشحالی کو میر سید علی ہمدانیؒ کے فیوض و برکات سمجھتے ہیں۔"[1]

کشمیری تاریخ کے ایک محقق صاحبزادہ حسن شاہ رقمطراز ہیں :-

"تاریخ گواہ ہے کہ کشمیر میں عجمی (غیر ہندی) تمدن کے درود اور فنون و آداب کی رونق صرف میر سید علی ہمدانیؒ کی کوششوں کی رہین منت ہے۔"[2]

علمائے کشمیر کا اعتراف

حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کے ان احسانات کو کشمیر کے مسلمانوں نے کسی بھی دور میں نہیں بھلایا، ہر دور کے علماء، مشائخ اور ارباب فکر نے انھیں خراج عقیدت ادا کرنے کی کوشش کی ہے، اور ان سے اپنے تعلق و نسبت پر محبت و احترام سے بھرے ہوئے الفاظ میں فخر کا اظہار کیا ہے، حضرت شیخ یعقوب صرفی (استاد مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ) جیسے محدث و مفسر اور روحانی پیشوا ان کی شان میں فرماتے ہیں :- ؎

گرچہ ز صد راہ سوئے مطلب است   راہِ امام ہمدان اقرب است
وہ چہ نکو راہی و خوش رہبری   رہبر او در رہ دیں حیدری
ہمچو علی دانش ربانیش   زاں لقب آمد علی ثانیش
سلسلۂ او کہ در آئینِ عشق   آمدہ زنجیر مجانینِ عشق

---

[1] اصول تصوف :- ڈاکٹر احسان اللہ، مطبوعہ تہران۔ ص ۲۹۵ [2] الارتقاء الثقافی بکشمیر فی عہد السلاطین :- مجلہ ثقافۃ الہند، دہلی ۱۹۶۵ء جولائی

بستۂ ایں سلسلہ آبادیِ من   چوں دلِ دیوانہ و شیدای من
صرفیٔ مسکین ہوا خواہ اوست   از دل و جاں بندۂ درگاہ اوست[1]

ایک اور بزرگ مرزا اکمل الدین خان بدخشیؒ نے کشمیر پر ان کے احسانات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے ساتھ اپنی روحانی وابستگی کو اپنی سب سے قیمتی پونجی قرار دی ہے۔ ؎

ایں علی غوث اہل دیں بود ست   ہم بہر غوث جانشین بود ست
قطب الاقطاب مرشد و ہادی   روح پاکش بنور حق محرم
اہل کشمیر را پناہ است او   رہبر خلق تا الٰہ است او
شکر للہ کہ از مریدانم   غیر از و دیگرے نمی دانم
ہرچہ در من ہمہ از ایشاں است   وقف عشقش مرا دل و جان است
اندراں آستاں غلامم من   مدح خوانش بصبح و شامم من

غیر ازیں شاہ کس نمی دانم
ذکر یا شاہ ہر زماں خوانم[2]

حضرت امیر کبیرؒ نے تبلیغ دین اور تربیت باطن کے ساتھ ساتھ عربی و دینی علوم اور اسلامی فکر و ثقافت کی اشاعت و استحکام کی طرف جو توجہ کی تھی اس کی اہمیت اور وسعت کا اندازہ صرف اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنے ساتھ علماء اور صوفیہ ہی کو یہاں لائے بلکہ صنعت کاروں، کاریگروں اور فن و ادب کے ماہروں کو بھی کشمیر کی طرف راغب کیا، ان ہی میں وہ معمار بھی شامل تھے، جنھوں نے یہاں عالیشان مسجدیں اور خانقاہیں تعمیر کیں، اور کشمیر کو پہلی مرتبہ اسلامی فنِ تعمیر سے روشناس کیا۔

---

[1] پوری منقبت کیلئے میر حبیب اللہ کاملی مرحوم کا ترتیب دیا ہوا "دیوان صرفی" مطبوعہ سرینگر دیکھا جائے نیز ملاحظہ ہو تذکرہ شعرائے کشمیر، مولفہ حسام الدین راشدی جلد اول اقبال اکاڈمی کراچی، [2] بحر العرفان شیخ اکمل الدین بدخشی تصحیح و ترتیب میر حبیب اللہ کاملی، مطبوعہ بردہ کاز پریس ۱۳۸۱ھ جلد اول

حضرت امیرؒ بلند پایہ عالم اور مصنف تھے، انھوں نے مختلف دینی، ادبی اور فکری موضوعات پر عربی اور فارسی زبان میں ڈیڑھ سو سے زائد چھوٹی بڑی کتابیں لکھی ہیں، مورخ حسن ان کی تعداد ۱۰۰ بتاتے ہیں[1] جب کہ شیخ عبد الوہاب نوری نے لکھا ہے کہ انھوں نے ۱۷۰ کتابیں لکھی ہیں[2]، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان میں پچاس فقیر کی نظروں سے گزری ہیں[3]۔ آج بھی کم و بیش اسی کتابیں ہندوستان و پاکستان اور ایران کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں[4]، ان میں پندرہ کتابیں مختلف جگہوں پر شائع بھی ہو چکی ہیں[5]۔

تحریری سرمائے سے محدود فائدے اور اس کے اسباب

تاہم میر سید علی ہمدانیؒ کے تحریری سرمائے سے کشمیر کے مسلمان ابتدائی دور میں زیادہ فائدہ اٹھا نہیں سکے تھے، حضرت امیرؒ کو بھی اس کا شکوہ آمیز احساس تھا، ان کے ایک قدیم کشمیری تذکرہ نگار لکھتے ہیں،

"حضرت امیر کبیرؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ مجھے اس زمانے میں کسی نے نہیں پہچانا لیکن میری وفات کے ایک سو سال بعد علم کے ایسے طالب وجود پیدا ہونگے جو میری قدر پہچانیں گے اور میری کتابوں سے فائدہ اٹھا کر کمال حاصل کریں گے[1]۔"

کشمیر میں علوم کی جانب ابتدائی دور کے مسلمانوں کی کم توجہی کے پیچھے کچھ معقول وجوہ تھے، مثلاً کشمیر کے لوگ ہزارہا سال سے غیر اسلامی فکر و تہذیب اور ہندی علم و دانش کے پیرو تھے، اب جب کہ وہ حضرت امیرؒ کی مساعی جمیلہ سے ایک نئے مذہب میں داخل اور نئی ثقافت سے آشنا ہو رہے تھے، تو صدق دلی سے اسلام قبول کرنے کے باوجود ان کا پرانا ذوق دیر تک برقرار رہا۔ اسی طرح کشمیر دوسرے اسلامی ممالک سے اپنے علٰحدہ سیاسی وجود اور مخصوص

۱؎ تاریخ حسن ج ۳۔ ۲؎ فتوحاتِ کبرویہ (قلمی) ۳؎ ایضاً ۴؎ امیر کبیر سید علی ہمدانی۔ سیدہ اشرف ظفر، لاہور ۱۹۷۲ء ۵؎ فتوحاتِ کبرویہ (قلمی)

جغرافیائی ہیئت کی بنا پر الگ تھلگ تھا، ذرائع آمد و رفت محدود تھے، دوسری طرف یہاں کی غیر اسلامی تہذیب کی جڑیں کافی گہری تھیں، جسے اسلام کے ساتھ کسی قسم کا میل نہیں تھا۔ حضرت امیرؒ کے لئے یہ صرف اصلاح و تجدید کا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ ان کے سامنے مکمل تخریب و تعمیر کی مہم تھی، مزید برآں اس زمانے میں اہل کشمیر کی زبان سنسکرت تھی، اسی میں تصنیف و تالیف کا کام بھی ہوتا تھا، اب جو مسلمان اہل علم و قلم یہاں وارد ہوئے، ان کی علمی صلاحیتوں کے قدرداں تقریباً مفقود تھے، یہی وجہ ہے، کہ ان سب بزرگوں نے اپنی سرگرمی تبلیغ و تدریس تک ہی محدود رکھی، کیونکہ تحریر کے لیے حالات نامساعد اور ناموافق تھے۔

سلطان قطب الدین کے عہد کی درسگاہیں اور ممتاز مدرس

سلطان قطب الدین (۱۳۷۳ء تا ۱۳۸۹ء) شاہمیری خاندان کا چوتھا حکمران تھا، حضرت امیر سید علی ہمدانیؒ جب دوسری مرتبہ سات سو رفقاء کے ساتھ کشمیر تشریف لائے تو یہ سلطان قطب الدین ہی کا عہد حکومت تھا، سلطان جو پہلے ہی حضرت امیرؒ کا معتقد تھا، حضرت امیرؒ سے عقیدت و محبت سے ملا۔ سلطان اگرچہ مسلمان تھا، مگر اسلامی احکام سے ناواقف تھا، اس کے عقد میں ایک ساتھ دو سگی بہنیں تھیں، حضرت امیرؒ جونہی اس سے باخبر ہوئے تو سلطان کو ایک بیوی کو طلاق دینے کا حکم دیا۔ جسے سلطان فوراً بجا لایا[1]۔

حضرت امیرؒ کے جملہ ساتھی علم و فضل اور زہد و تقویٰ سے آراستہ تھے، ان میں کچھ بزرگوں نے درس و تدریس کے میدان میں بھی خاصی شہرت حاصل کی، حضرت امیر کے خال سید جلال الدین بخاری بلند پایہ محدث اور مفسر تھے، ان دو فنون میں مدرس کی حیثیت سے بھی بڑے مشہور و مقبول ہوئے[2]۔ حضرت امیر ہی کے رفقاء میں سید احمد اور سید محمد

۱؎ اسرار الابرار (قلمی)، شیخ داؤد مشکاتی محدث۔ ۲؎ تاریخ کشمیر (قلمی)، سید علی مورخ۔

کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ لے کر کشمیر آرہے تھے، تو راستہ میں ڈاکوؤں نے کتابوں کی بوریوں کو مال ومتاع سمجھ کر چرالیا۔ ان کے ایک اور رفیق سید محمد کاظم تھے، ان کے کتاب خانے کے مہتمم بنے[1] سید رکن الدین اور سید فخر الدین فقہ کی تعلیم وتدریس میں مشہور ہوئے تھے، شیخ نور الدین بدخشی، ملا قوام الدین بدخشی اور شیخ محمد الشامی عربی ودینی علوم کے اساتذہ اور مصنف تھے۔

مدرسہ سلطان قطب الدین: سلطان قطب الدین کے عہد میں سلطان کے زمانہ میں تین درسگاہوں کو نمایاں شہرت حاصل ہوئی، ان میں سر فہرست خود سلطان کی اپنی قائم کی ہوئی درسگاہ بھی ہے، اسے سلطان نے دار الحکومت قطب الدین پورہ (موجودہ محلہ سرنگر) میں اپنی خاص نگرانی میں تعمیر کرایا، اس کے ساتھ ایک دار الاقامہ بھی ملحق تھا، جس میں دور دراز کے طلبہ اقامت کرتے تھے، ان کے لئے حکومت ہی کی جانب سے طعام وقیام اور مصارف تعلیم کا مفت انتظام تھا، طلبہ سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی، اس درسگاہ کے پہلے صدر مدرس حاجی محمد قاری تھے، چکوں کے آخری دور حکومت میں اس منصب جلیل پر مولانا رضی الدین کشمیری فائز ہوئے تھے، جن کے علم وفضل کا بین ثبوت یہ ہے کہ شیخ یعقوب صرفی جیسے محدث، علامہ داؤد خاکی جیسے فقیہ اور صوفی اور مولانا شمس الدین پال جیسے حافظ حدیث انہی کے شاگرد رہ چکے تھے، جہانگیر کے عہد میں اس منصب پر مولانا جوہر ناتھ کشمیری محدث فائز ہوئے تھے، وہ علامہ ابن حجر ہیثمی کے شاگرد تھے، اور کشمیر میں ایک بہت بڑے محدث کی حیثیت سے مشہور ومحترم رہے۔ یہ دار العلوم صدیوں تک اہل کشمیر کی علمی ودینی خدمات انجام دیتا رہا۔ جب سکھ سنہ ۱۲۳۴ھ یا ۱۸۱۹ء میں کشمیر پر قابض ہوئے تو اس ادارے کے سارے

[1] فتوحات کبرویہ (قلمی)، شیخ عبد الوہاب نوری [2] ایضاً

ذرائع آمدنی بند کرکے اسے مقفل کردیا، اگر یہ ادارہ تعصب کا شکار نہ ہوا ہوتا تو آج ہندستان کی قدیم ترین تاریخی یونیورسٹیوں میں شمار کیا جاتا، سلطان سکندر اور سلطان زین العابدین کے دور حکومت میں عراق وخراسان کے تشنگان علم جوق درجوق وارد ہوکر اس چشمۂ صافی سے سیراب ہوتے تھے۔

مدرسۃ القرآن: سلطان قطب الدین ہی نے قرآن حکیم کی تعلیم عام کرنے کے لیے حضرت امیر سید علی ہمدانیؒ کی ہدایت پر ایک مدرسہ تعمیر کرایا، جس کے ذریعہ سے کشمیر میں وسیع پیمانے پر قرآن حکیم کا پڑھنا اور پڑھانا عام ہوا، حضرت امیرؒ کے رفقاء میں جو حضرات تجوید وقرأت کے ماہر تھے، وہ یہاں حزم وحذاقت سے طلبہ کو قرآن مجید پڑھاتے تھے، ان کے سربراہ الشیخ مولانا سلیمان تھے، جنھیں حکومت کی جانب سے امام القراءؒ کا خطاب ملا تھا۔

مدرسہ عروۃ الوثقیٰ: قطب شاہی دور ہی کے مدارس میں حضرت سید جمال الدین محدث کی ذاتی درسگاہ بھی بڑی شہرت رکھتی تھی، وہ متبحر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت امیرؒ کے قرابت دار بھی تھے، مورخ سید علی ان کے علم وفضل اور اثر ورسوخ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"سید جمال الدین بڑے پائے کے محدث اور مفسر تھے، وہ دینی اور عقلی علوم میں کمال رکھتے تھے، سلطان قطب الدین نے انھیں حضرت امیر کبیرؒ کے حلقے سے بصد فخر طلب کرکے کشمیر میں ٹھہرایا، اس ملک کے اکثر رہنے والوں نے ان سے استفادہ کیا ہے۔"[1]

کشمیر میں ان کا مدرسہ عروۃ الوثقیٰ کے نام سے موسوم تھا، گردش زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ نام بگڑ کر "آرودٹھ" بن گیا" اب مدرسے کا کوئی نشان باقی نہیں رہا ہے، تاہم ایک محلہ

[1] تاریخ کشمیر، سید علی۔

جہاں حضرت سید جمال الدین دفن ہیں، اسی نام سے موسوم ہے۔

سلطان سکندر اور اسلامی ثقافت کی ترویج واشاعت

سلطان قطب الدین نے ۱۶ سال اور ۵ ماہ حکومت کرنے کے بعد ۱۳۸۹ء میں انتقال کیا، حضرت امیر سید علی ہمدانیؒ دس سال قبل دنیا سے رحلت کر چکے تھے، انتقال کے وقت ان کے فرزند میر سید محمد ہمدانیؒ کی عمر بارہ[۲] سال تھی، وہ اپنے والد بزرگوار کی وصیت کے مطابق بائیس[۲۲] سال کی عمر میں کشمیر تشریف لائے، اور ان ہی دنوں سلطان قطب الدین کا بیٹا سکندر تخت نشین ہوا تھا، وہ خود اس وقت میر سید محمد ہمدانیؒ ہی کی طرح نوجوان تھا، سلطان سکندر میر محمد ہمدانیؒ کا اسی طرح دل وجان سے عقیدت مند بن گیا، جس طرح اس سے قبل اس کا باپ قطب الدین، حضرت امیر کبیرؒ کا معتقد اور حلقہ بگوش تھا، اس نے ان ہی کے ایماء پر کشمیر میں اسلامی فکر کی ترویج میں کھل کر دلچسپی لی۔ سکندر کے دور میں ہی علمی اور تربیتی اداروں، خانقاہوں، مسجدوں اور مقبروں کی تعمیر وتوسیع عمل میں آئی، اور اس میں سکندر کے نومسلم وزیر اعظم ملک صدرالدین (سابق سہہ بٹ) نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان تبدیلیوں سے ہندوؤں کے اونچے طبقے یعنی برہمنوں میں بڑی بددلی پیدا ہوئی، ان میں جو لوگ صاحب قلم تھے، انھوں نے سلطان اور اس کے وزیر اعظم پر مندر شکنی کے بے بنیاد الزامات عائد کرکے بدنام کرنے کی کوشش کی، مورخوں کو طویل مدت تک ان الزامات پر یقین رہا، مگر عصر حاضر کے سرکردہ مورخوں نے تاریخی حقائق وواقعات کی روشنی میں ان الزامات کا بے بنیاد ہونا ثابت کیا ہے۔[۱]

سکندر کے زمانے میں لوگ جوق در جوق دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، اور کشمیر سچ مچ

[۱] اس کیلئے مرحوم ڈاکٹر الحاج محی الدین صوفی کی ہسٹری آف کشمیر کی دوسری جلد، پروفیسر محب الحسن صاحب کی کشمیر سلاطین کے عہد میں، اور ڈاکٹر پاروموکی اے ہسٹری آف مسلم رول ان کشمیر مطالعہ کرنے کیلئے کافی ہیں۔

اس دور میں ایک فلاحی اسلامی مملکت کی صورت میں ابھر گیا تھا، سکندر نے عملاً شریعت نافذ کرنے میں دلچسپی ظاہر کی، اس نے بدعات وخرافات پر پابندی عائد کرکے رنگ رلیوں اور غیر شائستہ حرکتوں کا خاتمہ کر ڈالا، رفاہ عامہ کے لیے جس قدر ہو سکا مختلف تعمیری کام انجام دیئے، ان میں ہسپتالوں کا قیام شامل ہے، جہاں بیماروں کو ادویہ اور معنت خوراک دی جاتی تھی، اس نے ذمیوں پر ان کے جان ومال کے تحفظ کی خاطر کچھ ٹیکس لگایا جسے بعد میں اس کے بیٹے زین العابدینؒ نے کم کر دیا تھا۔

شیخ الاسلام کے منصب کا قیام

سلطان سکندر نے پہلی مرتبہ کشمیر میں شیخ الاسلام کا ایک مستقل عہدہ قائم کیا، مولانا محمد فاضل بخاری پہلے بزرگ عالم تھے، جو اس منصب پر فائز ہوئے تھے، سلطان سکندر اہم ملکی اور دینی معاملات میں ان کی طرف رجوع کرتا تھا، وہ اصلاً بخارا سے تعلق رکھتے تھے، جب کشمیر وارد ہوئے تو نوشہرہ سرینگر میں قیام کیا، یہاں انھوں نے ایک علحدہ دینی مدرسہ قائم کیا۔ جس کا آگے ذکر آتا ہے، اگرچہ ملک حیدر چاڈورہ نے اس ادارے کے قیام کا سہرا سلطان زین العابدین کے سر باندھنے کی کوشش کی ہے اور ملا کبیر کو ملک کا پہلا شیخ الاسلام ٹھہرایا ہے[۱]۔ مگر صاحب تحائف الابرار نے واضح الفاظ میں سلطان سکندر کے حالات میں لکھا ہے۔

"مولانا افضل شیخ الاسلامی کے منصب پر فائز ہوئے، انھوں نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا"[۲]

علماء اور مدارس کی سرپرستی

سلطان سکندر تعلیم کی اشاعت اور علوم وفنون کی ترویج میں اس قدر سرگرم عمل ہوا کہ مختصر سی مدت میں پوری مملکت کی کایا پلٹ ہو گئی، بیرونی

[۱] تاریخ کشمیر، ملک حیدر چاڈورہ، نسخہ ریسرچ لائبریری سرینگر، رقم ۳۹ ص ۶۰ [۲] تحائف الابرار (قلمی)

ممالک کے علماء کے لیے تقرب سلطانی کا آسان ذریعہ تصنیف و تالیف تھا، سلطان باصلاحیت علماء اور ارباب فن و ادب کی عزت افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا تھا، خراسان سے تعلق رکھنے والے ایک عالم شیخ احمد سامانی نے فرائض کی مشہور کتاب سراجی کی عربی شرح عربی میں لکھکر بڑی آسانی سے دربار سلطانی میں قرب و منزلت حاصل کی، وہ خود اس شرح کے پیش لفظ میں اعتراف کرتے ہیں:۔

شروع ہی سے میرے دل میں یہ تمنا تھی، کہ میں اس بلند چوکھٹ اور روشن منبر کو چوموں، جو حاجت مندوں کی قصد گاہ اور بڑے بڑے ... مدارج و مراتب رکھنے والوں کی منزل ہے، اسکی وجہ سے اس نے اپنی بنیاد ایک گلستان (کشمیر مراد ہے) میں ڈالی ہے، اور بلندیوں کی تلاش و جستجو کے لیے آسمان میں سیڑھی کھڑی کی ہے، میری مراد اس بادشاہ جلیل، قوموں کے فرمانروا اور دین و دنیا کے پیشوا شان و شکوہ کے مالک اور اسلام اور مسلمانوں کے فریادرس سے ہے جس کا نام سلطان سکندر شاہ بن سلطان قطب الدین بن سلطان علاء الدین ہے، خدا جملہ مخلوقات پر اس کا سایہ پھیلائے، اور زمانے کے آخری دنوں تک اس کے جاہ و جلال میں افزونی کرے، میں نے اس آرزو کو پورا کرنے کے لیے پہلے کوئی ذریعہ نہیں پایا یہاں تک کہ میں یہ سطور لکھنے میں کامیاب ہوا، چنانچہ یہ کتاب لکھکر میں نے اسی کو سلطان کے حضور پہنچنے کے لیے ذریعہ بنایا، میں نے اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے ایسا کیا جو ہر مشکل کو آسان کرنے والا ہے، ہر مشکل معاملے میں مددگار ہے، جو بہتر آقا اور بہتر مدد کرنے والا ہے[1]

اس اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سلطان سکندر کے زمانے میں کشمیر میں اسلام کی اشاعت پورے طور پر ہوئی سلطان سکندر بے شمار بیرونی ممالک سے تعلق رکھنے والے علماء ارباب فن

[1] تنویر السراج (قلمی)، نسخہ ریسرچ لائبریری سرینگر رقم / ۱۱۳

اور صوفیا نے مبلغین کا قدردان سمجھا جاتا تھا، پھر اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ سلطان کا مقرب بننے کے لیے علمی، فکری اور فنی صلاحیتوں سے بہرہ مند ہونا ضروری تھا، اس کا دربار مذہبی منافرت و تعصب پھیلانے والوں، چاپلوسوں، ابن الوقتوں یا غیر مسلموں کو پریشان کرنے والوں سے پاک و صاف تھا۔

سلطان سکندر نے اپنے باپ سلطان قطب الدین کے قائم کئے ہوئے مدرسے کے طرز پر نوہٹہ (سرینگر) میں ایک اور مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی، بخارا کے ایک فاضل سید محمد علی کو اس کا صدر مدرس مقرر کیا۔ اس مدرسے کے مشہور اساتذہ میں مولانا سید حسین منطقی، مولانا محمد یوسف، مولانا صدر الدین کاشی اور مولانا محمد افضل جیسے ممتاز علماء بھی شامل تھے، بالخصوص مولانا محمد افضل بخاری بلند درجے کے عالم اور ملک کے شیخ الاسلام بھی تھے، انھوں نے خود بھی ایک مدرسہ نوشہرہ میں قائم کیا، حکومتِ وقت نے اس مدرسے کے مصارف پورا کرنے کی غرض سے علاقہ ناگام کے کچھ گاؤں کی آمدنی وقف کر رکھی تھی، مولانا محمد افضل کا جب انتقال ہوا تو اسی مدرسے کے متصل دفنائے گئے[1]"

سلطان سکندر کے زمانے میں بہت سی مسجدیں اور خانقاہیں بھی کشمیر میں تعمیر ہوئیں۔ یہاں اسی نے پہلی مرتبہ ایک جامع مسجد بھی بنوائی، تدریسی رونق کا یہ حال تھا کہ ایران، افغانستان اور خراسان یہاں تک کہ عراق اور شام کے بے شمار علماء یہاں وارد ہو کر جہاں جہاں مقیم ہوئے وہاں درس و تدریس کی مجلسیں گرم ہوئیں، ملا عبدالباقی نہاوندی، لکھتے ہیں:۔

"سکندر کے زمانے میں عراق اور خراسان کے علماء، کشمیر وارد ہو کر بادشاہ کے سایۂ رحمت و شفقت میں مالا مال ہوئے اس سے کشمیر میں اسلام کی اشاعت بھی ہوئی[2]"

[1] تحفۃ الابرار [2] مآثر رحیمی، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۹۳۱ء ج ۲، ص ۵۰

ابوالقاسم فرشتہ نے درست لکھا ہے کہ کشمیر سلطان سکندر کے زمانے میں علوم وفنون کی
گرم بازاری میں مشہور علمی مراکز کے ہمسر بن گیا۔

"سکندر اس پائے کا فیاض تھا، کہ اس کی فیاضی کی شہرت سنتے ہی عراق، خراسان
اور ماوراءالنہر سے علما اور دانشمند اس کی ملازمت سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے
کشمیر وارد ہوئے، جس سے کشمیر میں اسلام اور اسلامی علوم کی ایسی عظیم الشان ترویج
ہوئی کہ یہ ملک عراق اور خراسان کا نمونہ بن گیا[1]"

سلطان سکندر ہی کے عہد میں امیر تیمور گورگانی اطراف وجوانب تہس نہس کر کے جموں
تک آپہنچا، اس نے کشمیر آنے کا بھی ارادہ کیا، مگر سکندر کی بصیرت اس کے سامنے ناقابل عبور
دیوار کی طرح حائل ہوئی، اس نے تیمور کو کشمیر کی طرف رخ کرنے سے قبل ہی اپنے ایک نمائندے
مولانا نورالدین کو تحائف کے ساتھ اس کے پاس بھیج دیا، اور اپنی اطاعت وپیروی کا یقین دلایا۔[2]
عملاً اطاعت کی نوبت کبھی نہیں آئی، مگر اس سے حملہ آور خوش ہوا، اور کشمیر آنے کا ارادہ منسوخ
کیا۔ اس طرح ایک ابھرتی ہوئی اسلامی مملکت خاک میں ملنے سے محفوظ رہی۔

سلطان زین العابدین کی تخت نشینی

سلطان سکندر کے بعد اس کا بیٹا علی شاہ تخت نشین ہوا، اگرچہ
اس نے سات سال (۱۴۱۳ء تا ۱۴۲۰ء) حکومت کی تاہم اس کے دور کا کوئی قابل ذکر کارنامہ
تاریخوں میں محفوظ نہیں ہے، اس نے اپنے زمانہ حکومت کے دوران حج پر جانے کا ارادہ کیا اور اقتدار
اپنے چھوٹے بھائی زین العابدین کو سونپا، مگر جونہی وہ جموں پہنچا تو اپنے سوتیلے نانا[3] بلادیو حکمران جموں کے

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۱۸۱ [2] تاریخ حبیب السیر فی اخبار افراد البشر۔ غیاث الدین حسینی (خواند امیر) ج ۳ ص ۲۱۹
وتاریخ روضۃ الصفا۔ میر خواند۔ ج ۶ ص ۱۰۸ [3] سکندر کی ایک چہیتی بیوی ہندو خاتون شیبا دیوی تھی وہ جموں کے حکمران
بلادیو کی بیٹی تھی۔ سکندر کے اپنے سسرال کے ساتھ خوشگوار تعلقات تھے، اس رشتے میں بھی کوئی حیرت نہیں تھا۔

بہکاوے اور لعنت وملامت کے زیر اثر حج کا ارادہ فسخ کیا، اور بھائی سے اقتدار واپس لینے کا
ارادہ کیا، زین العابدین نے کسی ٹکراؤ کے بغیر علی شاہ کو اقتدار واپس کر دیا، ڈاکٹر پارمو لکھتے
ہیں کہ اس میں علی شاہ کی نیت حج ہی صاف نہیں تھی، مگر ڈاکٹر ژتشی نے اسے رد کرتے ہوئے
واضح الفاظ میں لکھا ہے، کہ جموں کے حکمران بلادیو ہی کے اکسانے پر علی شاہ اقتدار پر جمے رہنے
پر آمادہ ہوا۔[1] تاہم دوسری مرتبہ اقتدار سنبھالنے کے چند ہی ماہ بعد وہ انتقال کر گیا، اور اب
اس کا بھائی زین العابدین بڈشاہ بلا شرکت غیرے کشمیر کا حکمران بن گیا۔

سلطان زین العابدین کی ذاتی زندگی اور اس کا دینی مزاج

زین العابدین کو نصف صدی (۱۴۲۰ء تا ۱۴۷۰ء) تک حکومت
کرنے کا موقع ملا۔ اس کا دور شاہمیری حکومت کا عہد زریں کہلانے
کا مستحق ہے، اس نے اسلامی ممالک سے ثقافتی روابط قائم کر کے انہیں مستحکم کرنے کی کوشش کی،
کچھ مدارس اور علمی ادارے بھی کھولے، علماء کی سرپرستی بھی کی، وہ یقیناً اپنی علم دوستی اور علماء نوازی
میں دنیا کے معدودے چند حکمرانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے، وہ خود بھی فارسی، تبتی، سنسکرت
اور کشمیری زبانوں کا عالم تھا، اسی طرح فارسی کی راہ سے عربی سے بھی واقفیت رکھتا تھا۔

مورخ غلام حسن مرحوم لکھتے ہیں:

"اس نے حدیث کی کتابیں حرمین شریفین سے بڑے شوق وذوق سے منگوائیں
اور پھر پورے انہماک سے ان کا مطالعہ کرتا تھا"[2]

اسے اطلاع ملی کہ مکہ مکرمہ میں علامہ جاراللہ زمخشری کے ہاتھ کا لکھا ہوا تفسیر کشاف
کا نسخہ موجود ہے۔ تو فوراً اس کی نقل منگوانے کا انتظام کیا[3]، اس نے کشمیر میں شیخ الاسلام کے

---

[1] Sultan Zainul-Abidin of Kashmir. P33

[2] تاریخ حسن ج ۲ ص ۱۹۵ [3] تاریخ بڈشاہی۔ منشی محمد الدین فوق۔ ص ۳۶۲

ادارے، منصب کو زینت بخشی اور بذاتِ خود ملکی اور سیاسی معاملات میں شیخ الاسلام کے پاس آکر مشورہ حاصل کرتا تھا۔

خود اکثر اوقات برائے استفادہ بخدمت ایشاں می رفت۔[۱]

اسی طرح زین العابدین نے حاجب کا عہدہ بھی قائم کیا۔ حاجب کی اجازت کے بغیر سلطان کے بیٹوں کو بھی باپ سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔[۲] اس کے عہد میں خلافت اور خلیفہ کا وجود برائے نام ہو کر رہ گیا تھا، مگر سلطان نے ملک میں خلیفہ کا نائب ہی بن کر رہنا پسند کیا۔[۳]

سلطان زین العابدین دل و جان سے صوفیائے کرام کا عقیدت مندانہ تھا۔ حضرت شیخ نور الدین ولی کشمیری کی میت کو سلطان نے خود بھی کندھا دیا تھا، اور نمازِ جنازہ میں شرکت کی تھی۔[۴] حضرت شیخ کے علاوہ وہ حضرت سید ناصر بیہقی، سید محمد رفاعی (عرف جانباز ولی) سید محمد برخوردار اور سید محمد عالی سے بھی مستفید ہوتا تھا، اس نے ان میں سے بعض بزرگوں کے لیے خانقاہیں بنوائیں، اور ان کے اخراجات کے لیے جاگیریں مقرر کیں، قدیم شاہمیری حکمران ہندو عورتوں کے ساتھ شادی کرتے تھے، جب کہ خود سلطان زین العابدین کی اہلیہ مشہور بزرگ سید محمد کاندعامی بیہقی کی نیک سیرت دختر تھی، اس نے اپنے زیورات سے ایک علحدہ مقبرہ بنوایا تھا جس میں کسی بزرگ کے آسودہ ہونے کی تمنا کرتی تھی، چنانچہ خدا نے اس کی یہ تمنا اس طرح پوری کر ایک دوسرے قابلِ احترام بزرگ اور روحانی پیشوا حضرت شیخ بہاء الدین گنج بخش کا جب انتقال ہوا تو انھیں اسی مقبرے میں سپردِ خاک کیا گیا، ان کے جنازے میں سلطان

[۱] تاریخ کشمیر، ملک حیدر چاڈورہ [۲] Kings of Kashmir Jonar- ajat T. Dutt
[۳] خوارق السالکین (قلمی) [۴] Kashmir- Its cultural Heritage: Kaumadi, P166

زین العابدین خود بھی شامل ہوا تھا۔[۱] سلطان نہ صرف ہاجر علماء اور مشائخ سے معنوی اور علمی استفادہ کرتا تھا، بلکہ اس نے ان سے جسمانی رشتے بھی قائم کیے، جہاں اس نے اپنے دو بیٹوں آدم خان اور حسن خان کو انہی ہاجر علماء کی اتالیقی میں رکھا، وہاں حسن خان کا نکاح حضرت سید ناصر بیہقی کی پوتی سے کیا۔ سلطان اس حد تک علماء اور صوفیائے کرام کے حلقۂ اثر میں تھا کہ بعض اوقات یہ علماء سلطان کو تنبیہ کرتے تھے، ایک بار شیخ طریقت حضرت سید محمد امین ویسی نے سلطان کی مجلس میں کوئی غیر شرعی حرکت مشاہدہ کی تو مجلس سے اٹھ گئے اور جنگل میں چھلانگ لگادی۔[۲] اس سے سلطان اس قدر کبیدہ خاطر ہوا کہ مجلس ہی برخاست کی۔

شاہمیری سلاطین کی ہندو نوازی

شاہمیری سلاطین کشمیر الاصل مسلمان تھے، اور اپنی سیاسی بالغ نظری اور فوجی مہارت و صلاحیت کے بل پر کشمیر کے حکمران ہوئے تھے، انھوں نے کشمیر کو امن و سکون، خوشحالی و فارغ البالی اور علوم و فنون کی ترقی سے ہمکنار کیا، یہ وہ زمانہ تھا۔ جب دوسرے اسلامی ممالک ایک سرے سے دوسرے سرے تک اضطراب اور انتشار کے شکار تھے، اس کے زیر اثر کچھ لوگوں نے کشمیر کی طرف ہجرت کی اور اسی کو اپنا مستقل وطن بنایا شاہمیری حکمرانوں کا بڑا جرم یہ ہے کہ انھوں نے ملکی و نسلی تعصب سے بالاتر ہو کر ان ہاجرین سے حسن سلوک کیا، اور ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا، اسی جرم کی پاداش میں وہ کچھ نسل پرست مورخوں کی تنقیص کا نشانہ بن گئے۔ . . . . . . تاہم یہ تاریخی حقیقت چھپائی نہیں جاسکتی ہے کہ شاہمیری حکمرانوں نے کبھی بھی رعایا پروری کی منصبی ذمہ داری سے غفلت نہیں برتی۔ کشمیر کے جو ہندو اپنے مذہب پر قائم تھے، ان کے ساتھ جبر و ظلم کا معاملہ روا نہیں رکھا گیا، ان سلاطین کی بیویاں ہندو خواتین تھیں، شاہمیری سلطنت کے بانی سلطان شمس الدین

[۱] Kashmir: Its Cultural Heritage: Kaumedi, P66
[۲] خوارق السالکین (قلمی)، ملا عبد الصبور

کو دیّا رانی کو اپنے ساتھ شادی کرنے کا پیغام دیا تھا، اسی طرح سلطان قطب الدین
کی بیوی بھی ہندو ہی تھی، اس کے باپ سلطان شہاب الدین کی بیوی کا نام لکشمی تھا۔
سلطان سکندر کی چہیتی بیوی اس کے ہمعصر جموں کے حکمراں بلادیو کی بیٹی سبھیا دیوی تھی۔
اس نے اپنے بیٹے زین العابدین کی تعلیم کے لیے ہندو اہل علم مقرر کئے تھے، ان سلاطین کے
درباروں میں مسلمان علماء کے ساتھ ساتھ ہندو اور بودھ اہل علم و دانش بھی ہوتے تھے،
مسٹر گنہار نے زین العابدین کے دربار میں دو بودھ عالموں کی نشاندہی کی ہے، اسیطرح
اس کے بھائی سلطان علی شاہ کے دربار میں بھی تلک اچاریہ ایک بودھ فاضل ہوتا تھا۔
خود سلطان زین العابدین کی ہندو نوازی کا یہ عالم تھا، کہ ہندو مورخوں نے اُسے وشنو اور
نرائن اوتار قرار دیا ہے،[1] زین العابدین کے بعد اس کا بیٹا حیدر شاہ (۱۴۷۰ء تا ۱۴۷۲ء)
تخت نشین ہوا، تو اس نے ایک ہندو نائی پکتی تار کو سیاہ و سفید کا مالک بنایا۔[2]

اسی طرح جملہ شاہمیری حکمرانوں نے اپنے اپنے زمانوں میں مندروں اور وہاروں کی
حفاظت کی۔ اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا ہوتا تو مسلمانوں کی زبردست اکثریت والی اس سرزمین
میں وہ پرانے مندر ہرگز موجود نہ ہوتے جو آج بھی موجود ہیں، تاہم اس دور میں مندروں کی مزید
تعمیر کا سلسلہ رک گیا تھا، جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہندو جوق در جوق اسلام قبول کرتے تھے،
اس لیے مندروں اور وہاروں کے بجائے مسجدوں، خانقاہوں اور حماموں کی تعمیرات شروع
ہونے لگیں، جہاں تک مندروں کے انہدام کا تعلق ہے، تو اس کی تردید خود بخود اسطرح ہوتی
ہے کہ مرزا حیدر دوغلات (دورِ حکومت ۱۵۴۲ء) اور مشہور مورخ ابوالفضل نے اپنے اپنے
زمانے کے ان بکثرت مضبوط و مستحکم مندروں کا ذکر کیا ہے، جن پر کوئی خراش بھی موجود

---

[1] Sultan Zainul - Abdin. Dr Zutshi. P94

[2] Rajtarangni: Shrivara Tr. Dutt, P186

نہیں تھی۔

مورخ جون راج نے سلطان سکندر کو ایک خوفناک بت شکن کی صورت میں پیش کیا ہے۔
اس کے بعد فرنگیوں نے اپنے سیاسی اغراض حاصل کرنے کے لیے اسے اپنی فریب کاری سے اور
زیادہ مہیب بنا دیا، مگر تاریخی شواہد سے صرف نظر عقل عام بھی اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار
نہیں ہے، جس خطۂ زمین کے ندی نالے، دریا اور جھیل، پہاڑ اور ٹیلے غرض ایک ایک چپہ
کسی نہ کسی دیوی یا دیوتا سے منسوب ہو وہاں مندروں اور مورتیوں کے انہدام سے سکندر کو
کونسا مقصد حاصل ہو سکتا تھا یہاں وہ جگہیں دکھا دیں۔ ۲۶ مقامات بشن اور ۲۲
جگہیں درگا سے منسوب ہیں، اب جو مذہب ہزاروں دیویوں اور دیوتاؤں کا قائل ہو
اس کے اقتدار کی وسعت کا کیا حال ہوگا، اور سکندر ان کی مذہبی حیثیت صرف مندر ڈھانے
سے کیسے تبدیل کر سکتا تھا۔

حق یہ ہے کہ سکندر کو بت شکن ثابت کرنا اس وقت تک مشکل ہے، جب تک کہ آنکھوں پر
نفرت اور تعصب کی عینک چڑھائی جائے، اس میں شک نہیں ہے کہ کشمیر میں کچھ مندر وقتاً فوقتاً
تباہ ہوئے ہیں، اور ان کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں، مگر اس میں جہاں سیلابوں زلزلوں
اور دوسری آسمانی آفتوں کا ہاتھ تھا، وہاں کچھ سرپھرے ہندو حکمرانوں کی بددلی کا بھی دخل
تھا ہندو دورِ حکومت میں جلوک، کلاس اور ہرش تینوں حکمرانوں نے مندر منہدم کرنے میں
بڑی دلچسپی لی تھی، اسی طرح سلاطین کے عہد میں یقیناً کچھ مندر تباہ ہوئے تھے، مگر ایسا
کسی مذہبی تعصب یا انتقام گیری کی بنا پر نہیں ہوا تھا، بلکہ اس زمانے میں کچھ مندروں کا
تقدس بری طرح مجروح ہو چکا تھا، یہ روحانی سکون کے بجائے پروہتوں کے مرکز بنے ہوئے
تھے۔ . . . اس لیے بعض اوقات سلاطین کو بھی ان میں مداخلت کرنا پڑتی تھی، سلطان

زین العابدین کو قدیم و جدید عہد کے مورخین نیم ہندو اور نراتن اوتار سمجھتے ہیں، مگر اسکے حالات میں ایک ہندی مورخ جون راج نے یہ واقعہ لکھا ہے، کہ ایک بار سلطان سرد امندر جو کشمیر کے شمال و مغرب کرشن گنگا اور مدھومتی کے متصل موجود تھا، کسی دیوی کی کرامت دیکھنے گیا، مگر دیوی اُسے دکھا نہیں سکی، سلطان مایوس ہوا، اور دیوی کی مورتی کو توڑ پھوڑ دیا۔[1]

اس طرح جون راج نے بڑے معصومانہ انداز میں اپنے ہیرو کے کارنامے بیان کرنے کے دوران اس وقت کے مندروں کی حالت سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔

زین العابدین کے عہد میں علمی و تدریسی سرگرمی، زین العابدین کے دورِ حکومت میں علمی ترقی پورے عروج پر پہنچی اس نے نوشہرہ (سرینگر) میں جو اس کا دار الحکومت تھا ایک عظیم الشان دار العلوم بنا کر کشمیر کے مشہور مدارس میں ایک اور کا اضافہ کیا، اس دار العلوم کے صدر مدرس شیخ الاسلام شیخ کبیر نحوی تھے، زین العابدین خود ان کی خدمت میں حاضر ہو کر مشورے حاصل کرتا تھا، انھوں نے وسط ایشیا کی اونچی درسگاہوں سے فراغت علمی حاصل کی تھی، اس درسگاہ کے ایک اور سرکردہ استاد ملا احمد تھے، وہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے جلیل القدر عالم تھے، ایک مرتبہ سلطان زین العابدین ان سے کسی بات پر ناراض ہوا، یہاں تک کہ انھیں کشمیر چھوڑنے کا حکم دیا، ملا احمد جب پکھلی کے مقام پہنچے تو سلطان کو درج ذیل دو عالمانہ شعر لکھکر بھیج دیے، ان میں کمال ادب اور ادبیت سے بھرپور انداز میں اپنی بے گناہی کا ذکر کیا!

نے بنجوم زمبتدا خبر کے | نہ بمنطق زجزو کل اثر کے
برمن این کسرہ جز چرا رانند | احمد از غیر منصرف خوانند[2]

---

[1] Rajtarangni Jonaraja, Tr. Mr Datt al

[2] تاریخ کشمیر: ملک حیدر۔

سلطان نے انھیں واپس بلالیا اگر کوئی قصور تھا تو اسے معاف کیا، اور سابقہ عزت افزائی بحال کی، اس دار العلوم کے دوسرے سرکردہ اساتذہ میں حافظ بغدادی، شیخ پارسا بخاری، شیخ جمال الدین خوارزمی (قاضی القضاۃ)، میر علی بخاری اور شیخ یوسف رشیدی کے نام قابل ذکر ہیں، یہ سب علماء جیسا کہ ان کی نسبت وطنی سے ظاہر ہے، غیر کشمیری تھے مگر جب یہاں وارد ہوئے تو کشمیر ہی کو اپنا مستقل وطن بنایا، اسے اپنی صلاحیتوں سے مالا مال کیا اور بالآخر اسی کی آغوش میں ہمیشہ کے لیے چھپ گئے۔

دار الترجمہ مدرسۂ نوشہرہ کے متصل زین العابدین نے ترجمے کا ایک مستقل ادارہ بھی قائم کیا تھا جس پر کئی دیہات کی آمدنی وقف تھی، سلطان نے عرب و عجم سے سینکڑوں مخطوطات منگوا کر اس ادارے میں جمع کیے، وہ انھیں حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی قیمت ادا کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔

اس کے حکم سے بہت سی عربی و فارسی کتابوں کا ہندی (سنسکرت) زبان میں ترجمہ کیا۔[1]

سنسکرت عالم اور مورخ شری ور نے اسی دار الترجمہ میں یوسف زلیخا کا سنسکرت میں ترجمہ کیا اور ملا احمد نے سنسکرت کی مشہور تاریخ کشمیر راج ترنگنی کو فارسی میں منتقل کیا اور اس کا نام بحر الاسمار رکھا۔ یہ ادارہ سلطان فتح شاہ ([illegible] تا ۱۵۱۴ء) کے عہد حکومت تک موجود تھا، پھر بے قدری کا شکار ہو کر مٹ گیا۔

سلطان زین العابدین کی بیوی گل خاتون نے بھی جھیل ڈل کے کنارے ایک اعلیٰ درجے کا مدرسہ پکھری بل کے مقام پر تعمیر کرایا،[2] اسکی عمارت بڑی وسیع و عریض تھی، جو ۳۶۰ کمروں پر

---

[1] مآثر رحیمی ج ۱ ص ۲۱۱ [2] ڈاکٹر جی ایم ڈی صوفی اے ہسٹری آف کشمیر ج ۲

منتقل تھی، مولانا اسمٰعیل شامی اس کے پہلے صدر مدرس مقرر ہوئے تھے، یہ جگہ اپنی خوبصورتی کے لحاظ سے مشہور نہیں ہے، بلکہ درس و تدریس اور تصنیف و تحقیق کے لئے بھی مناسب ہے، ڈیڑھ سو سال بعد دارا شکوہ نے جھیل ڈل ہی کے کنارے ایک پہاڑی کی چوٹی پر اہل علم بالخصوص وحدتِ ادیان کے علمبرداروں اور فلسفہ، تصوف کے ممتاز ماہروں کے غور و فکر کے لیے ایک پروقار نشست نگاہ تعمیر کی جو اس کی بیوی نادرہ بیگم معروف بہ پری بیگم کے نام پر پری محل سے مشہور ہوئی، یہ عمارت آج بھی موجود ہے، اور تاریخی حیثیت رکھتی ہے، علامہ شبلی نعمانی جب کشمیر تشریف لائے تھے، تو جھیل ڈل اور اس کے ماحول سے حد متاثر ہوئے تھے، چنانچہ اپنے مشہور قصیدۂ کشمیریہ میں فرماتے ہیں۔ ؎

آں جزیرے کہ بشہرست و بود نامش ڈل
گوئیا آئینہ درستِ عروسے زیباست
سینۂ صاف دلانست ہمانا کز لطف
ہرچہ در وے بود، از صفحۂ رویش پیداست
گرد وے گرد ڈل آں صف زدن لالہ و گل
چوں طرازیست کہ بر دامن شوخی رعناست[1]

زین العابدین کے زمانے میں سیالکوٹ میں ایک دینی مدرسے کو بڑی شہرت حاصل ہوئی تھی۔ سلطان زین العابدین اس مدرسے کی گرانقدر رقم کی صورت میں مدد کرتا تھا، بلکہ ایک مرتبہ سلطان کی بیوی نے اس کے لیے اپنے گلے کا ہار بھی دے دیا تھا۔[2] (باقی)

---

[1] کلیات شبلی، معارف پریس اعظم گڈھ، ص ۲۶ [2] ڈاکٹر صوفی، جلد دوم۔

اورنگزیب عالمگیر کی مذہبی رواداری

از

جناب عبدالرؤف صاحب ایم، اے اودئی کلاں، راجستھان،

اکبری عہد کے اوائل ہی سے مغل منصب داروں میں بلا امتیاز مذہب و ملت شمالی ہندوستان کی مختلف نسلوں اور جماعتوں کے لوگ شامل تھے، جن میں راجپوت خصوصی اہمیت کے حامل تھے، بعد ازاں دکن کے لوگوں بالخصوص مرہٹوں کی بھی ایک کثیر تعداد مغل امراء[1] میں شریک ہو گئی، ان مختلف نسلوں، جماعتوں اور مذہبی فرقوں کے باہم میل جول سے مغل دور خصوصاً شاہجہاں صاحبقراں کے آخر عہد حکومت میں جو حسین گنگا جمنی تہذیب پروان چڑھی، اس کا ذکر منشی چندر بھان برہمن[2] نے اپنی تصنیف گلدستہ میں نہایت خوبصورت اور دلکش انداز میں

---

[1] مغل انتظامیہ میں بقول سرجدو ناتھ سرکار تین ہزاری اور اس سے بلند تر درجات کے منصبدار امرائے اعظم کہلاتے تھے، اور تین ہزاری سے کمتر درجہ پر فائز امیر صرف منصبدار، ملاحظہ ہو د اے شارٹ ہسٹری آف اورنگزیب ہندی اڈیشن۔ ص ۲۲۳ مطبوعہ ۱۹۵۱ء لیکن ڈاکٹر محمد اطہر علی صاحب نے امراء کی اصطلاح کا اطلاق اُن تمام منصب داروں پر کیا ہے، جو ایک ہزاری اور اس سے اونچے تمام درجات کے مناصب پر فائز تھے ملاحظہ ہو۔ "اورنگزیب کے عہد میں مغل امراء" ص ۱۳ مطبوعہ ۱۹۶۵ء اس مضمون میں بھی لفظ امیر یا اس کی جمع امراء کا یہی مفہوم لیا جائے

[2] چندر بھان برہمن کی ولادت لاہور میں ہوئی تھی، تعلیم مشہور زمانہ عالم ملا عبدالحکیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی، بعد

کیا ہے۔ مغل حکمرانوں کے طبقۂ امراء میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل تھے، ان میں تورانی، ایرانی، افغانی، بخاری، ہندوستانی مسلمانوں کے علاوہ راجپوت و غیر راجپوت ہندو مثلاً برہمن، کایستھ اور دکنی بھی شامل تھے مگر یہاں اورنگزیب کے راجپوت، مرہٹہ اور شیعی امراء ہی کے ذکر پر اکتفا کیا جائے گا، کیونکہ بیشتر غیر مسلم مورخین اسے ہندو دشمن اور رافضی کش ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اورنگزیب عالمگیر کے عہد حکومت کی اکیاون[5] سالہ مدت کو مورخین نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، اولاً ۱۶۵۸ء تا ۱۶۸۰ء جب کہ شمالی ہندوستان میں مقیم رہا، ثانیاً زمانۂ قیام دکن[6] دونوں دور حکومت کے کل منصب داروں میں علی الترتیب غیر مسلم امراء کا فی صد تناسب[7] کیا تھا، سموگڈھ کے معرکہ (۲۹ مئی ۱۶۵۸ء) سے بیشتر اورنگزیب کے منصب داروں کی مجموعی تعداد ۱۲۴ تھی، ان میں صرف ۹ یعنی سات فی صد راجپوت تھے، اس کے برعکس شہزادہ عالیجاہ داراشکوہ کے ۸۰ منصبداروں میں ۲۲ (۲۷ء۵ فی صد) راجپوت تھے، اسوقت داراشکوہ کے طرفدار راجپوت امراء کی اکثریت کا سبب صرف یہ تھا، کہ وہ لوگ والی دربار یعنی شاہجہانی حکومت کے نمک خوار تھے، ان کے لیے دارا کی حمایت کے سوا کوئی دوسرا چارہ ہی نہ تھا، علاوہ ازیں انھوں نے دارا کی حمایت کسی جذبۂ وفاداری کی بنا پر نہیں کی، بلکہ ان کے ذہن میں یہ جذبہ کارفرما تھا، کہ دارا کی فتح سے ہندو دھرم کا احیاء ہوگا۔

(بقیہ حاشیہ صـ ۱۳۳) فراغت تعلیم وہ ملا شکر اللہ شیرازی کا منشی مقرر ہوا، پھر داراشکوہ کی ملازمت اختیار کرلی، دارا کی وفات ۳۰ اگست ۱۶۵۹ء کے بعد وہ بنارس چلا گیا، جہاں ۱۶۶۲ء میں فوت ہوا، چار چمن اور گلدستہ نامی تصانیف یادگار چھوڑیں۔ [5] اعداد و شمار اور فی صد تناسب بعد کے مضمون میں "اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں مغل امراء" از ڈاکٹر محمد اطہر علی صاحب سے ماخوذ ہیں [6] یعنی ۱۶۷۹ء تا ۱۷۰۷ء

اور کیا عجب کہ ان کا سیاسی تسلط و غلبہ بھی ہو جائے گا[1] اس امر کی تصدیق راجستھان کے "اتہاس کار" کرنل جیمس ٹاڈ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ "راٹھور جسونت سنگھ شاہجہان کے بیٹوں میں صاف گو اور سادہ مزاج دارا کو عیار سمجھتا تھا، اور اورنگزیب کی نسبت بہتر خیال رکھتا تھا، لیکن فی الحقیقت اسے اس پوری نسل سے شدید عداوت و نفرت تھی، اور انھیں (مغلوں کو) اپنے دھرم اور آزادی کا دشمن سمجھتا تھا، چنانچہ جنگ وراثت میں اس نے کبھی ایک بھائی کا، اور کبھی دوسرے بھائی کا ساتھ دیا، تو اس کی مصلحت اور پالیسی یہ تھی کہ وہ سب بھائی باہم لڑ کر کٹ مریں،[3] یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی

---

[1] مقدمہ رقعات عالمگیر [2] داراشکوہ بجائے سادہ مزاج انسان ہونے کے جیسا دیگر نے نخوت کا مجسمہ، غرور، ہمہ دانی کا پیکر، خود سر، خود بیں اور نہایت خود رائے شہزادہ تھا، جو لوگوں سے تحقیر و اہانت سے پیش آتا تھا، یہاں تک کہ بڑے بڑے امراء کے ساتھ بھی اس کا رویہ توہین آمیز ہوتا تھا، وہ وزیر مطلق علامی سعد اللہ خان تک کی تذلیل کرنے سے باز نہیں آتا تھا، خود شاہجہان کی رائے اس کی افتاد طبع کے بارے میں بہتر نہ تھی، چنانچہ وہ وقتاً فوقتاً اپنی اس رائے کا اظہار کرتا رہتا تھا، کہ شہزادہ شاہ بلند اقبال نے اچھے لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیا ہے، وہ متلون مزاج اور نظم جہانبانی و تسخیر قلوب کے فن سے نابلد اور بیگانہ تھا، تفصیل کے لیے دیکھیے داراشکوہ از ڈاکٹر قانون گو، ہسٹری آف شاہجہان آف دہلی از ڈاکٹر سکسینہ، رائز اینڈ فال آف دی مغل امپائر از ڈاکٹر ترپاٹھی، اینکڈوٹس آف اورنگزیب از سرکار، مقدمہ رقعات عالمگیر، نیز اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر از علامہ شبلیؒ [3] کریسنٹ ان انڈیا، ہندی ایڈیشن ص ۵۶، از پروفیسر سری رام شرما بحوالہ دی انالز اینڈ انٹیکیوٹیز آف راجستھان، از کرنل جیمز ٹاڈ، ہندوؤں کی معاندانہ روش کے لیے ملاحظہ ہو [4] مقدمہ رقعات عالمگیر صفحات ۳۴۳ تا ۳۴۸ [5] جسونت سنگھ کے غیر راجپوتی افعال کے لیے اسی تصنیف کے ص ۴۵ تا ۴۷ کا مطالعہ کیا جائے، افسوس کہ ڈاکٹر گوپی ناتھ شرما نے جسونت سنگھ کی شتر گربگی، فریب اور عیاری کو وقت کا تقاضا بتایا ہے، دیکھیے راجستھان کا اتہاس۔ ص ۴۴۴۔

اورنگزیب نے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد راجپوتوں اور علی الخصوص جسونت سنگھ سے اگرچہ صفت اور کینہ پرور انسان کے ساتھ بھی نہایت فیاضانہ سلوک روا رکھا، اور یہ اس کے روادارانہ سلوک ہی کا نتیجہ تھا کہ اس کے عہد میں راجپوت امراء کی حیثیت اور تعداد شاہجہانی دور کی نسبت زیادہ ہوگئی، ان میں مرزا راجہ جے سنگھ اور جسونت سنگھ ہفت ہزاری ذات و سوار نیز دو اسپہ، سہ اسپہ کے اعلیٰ ترین مناصب پر فائز ہوئے، جب کہ یہ دونوں شاہجہانی عہد میں صرف شش ہزاری منصب پر ہی مامور تھے، ان کے علاوہ رانا راج سنگھ اور راجہ رام سنگھ کچھواہہ شش ہزاری اور رائے سنگھ سسودیہ، چھپت سنگھ بندیلہ، رائے سنگھ راٹھور، اندر من دھندیرا، راؤ بھاؤ سنگھ ہاڈا، اور رانا بھیم سنگھ دوم وغیرہ پنج ہزاری منصب پر فائز ہو کر امراء کے زمرہ میں داخل تھے، یک ہزاری سے ساڑھے چار ہزاری منصب داروں تک بھی راجپوتوں کی ایک معتدبہ تعداد موجود تھی، جہانگیری عہد یعنی ۱۶۰۶ء میں راجہ مان سنگھ کو بنگال کی صوبہ داری سے واپس بلا لینے کے بعد سے لیکر ۱۶۵۸ء تک جبکہ جسونت سنگھ کو مالوہ کا صوبیدار بنایا گیا، باون[52] سالہ مدت میں کسی راجپوت کو مغل سلطنت کے کسی اہم صوبہ میں بحیثیت صوبیدار مقرر نہیں کیا گیا، جب کہ اورنگزیب کے دور حکومت میں عمدۃ الملک مرزا راجہ جے سنگھ کو دکن کا اور جسونت سنگھ کو دو دفعہ (۱۶۵۹ء تا ۱۶۶۱ء نیز ۱۶۷۰ء تا ۱۶۷۲ء) مالوہ کے اہم صوبہ کا صوبیدار بنایا گیا، اس سے قبل ۱۳ اگست ۱۶۵۸ء کو اورنگزیب نے جسونت سنگھ کو ڈھائی لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی کی جاگیر عطا کرتے ہوئے اپنی غیر موجودگی میں پایہ تخت دہلی کی حفاظت کا نگران بنایا پھر ۹ جون ۱۶۷۴ء سے اپنے انتقال (۲۰ نومبر ۱۶۷۸ء) تک جمرود (کابل) کا حاکم رہا، لیکن اس متعصب ہندو مہنت کے

[52] ویر ونود از کوی شیامل داس ج ۲ ص ۸۶۲ نیز مارواڑ کا اتہاس، از پنڈت ریو ج ۱ ص ۲۲۶۔

متعلق کہتے ہیں، کہ سرجدوناتھ سرکار اسے محض جمرود کا تھانہ دار بتلاتے ہیں[53]، یہ امر ناقابل فہم ہے کہ ایک ہفت ہزاری ذات و سوار اور دو اسپہ، سہ اسپہ منصبدار کو ایک شہر کا صرف تھانہ دار مقرر کیا جائے، امیر خاں پسر خلیل اللہ خاں کو جسونت سنگھ کے انتقال کے بعد ہی افغانستان کی گورنری پر تعینات کیا گیا تھا، جہاں وہ اپنی وفات (۲۸ اپریل ۱۶۹۸ء) تک اپنی خدمات انجام دیتا رہا۔

فرانسیسی سیاح ڈاکٹر برنیر بھی آگرہ میں ۱۶۶۵ء تک مقیم رہا، وہ اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ اورنگزیب نے راجپوتوں کو باعزت عہدے تفویض کئے اور ان کی ملازمت میں بہت سے راجپوت تھے، برنیر کے قول کی تائید اعداد و شمار سے بھی ہو جاتی ہے، جیسا کہ جنگ سموگڑھ میں اس کے ساتھ صرف سات فی صد راجپوت تھے، لیکن اورنگ نشین ہونے کے بعد اس کی حکومت کے پہلے دور میں راجپوتوں کا تناسب چودہ اعشاریہ چھ فیصد ہو گیا، البتہ دوسرے دور میں پانسو پچھتر منصبداروں میں تہتر یعنی بارہ اعشاریہ چھ فی صد راجپوت امراء تھے، دوسرے دور میں اس دو فیصد تخفیف کے پیش نظر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے عہد حکومت کے نصف آخر میں راجپوتوں کے ساتھ پہلے جیسا فیاضانہ سلوک روا نہیں رکھا، جسونت سنگھ کے انتقال کے بعد اس نے مارواڑ کے مسئلہ جانشینی کو جس طرح حل کرنا چاہا، اس سے بھی اس شبہ کو تقویت مل سکتی ہے، کیونکہ اس قضیہ کے سلسلہ میں راٹھور

[53] اے شارٹ ہسٹری آف اورنگزیب (ہندی) حاشیہ ص ۲۱۵ مطبوعہ ۱۹۵۱ء مگر ڈاکٹر گوپی ناتھ شرما شاہی کمانڈر شجاعت خان کے مارے جانے کے بعد اسے جمرود کا حاکم تسلیم کرتے ہیں، ملاحظہ ہو راجستھان کا اتہاس ص ۳۴۴، لین پول صاحب بھی اپنی تصنیف "اورنگزیب، ص ۱۳۶" پر اسے کابل کا گورنر تسلیم کرتے ہیں۔

اور سسودیہ راجپوت قبیلوں نے ۱۶۷۹ء میں بغاوت کر دی تھی، لیکن یہ بغاوت صرف انہی دو خاندانوں تک محدود رہی، اور کچھواہہ، ہاڑا، بھاٹی، یہاں تک کہ بیکانیر کے راٹھور شہنشاہ کے وفادار اور جاں نثار بنے رہے، اور ان کی امدادی فوج کے دستے سسودیہ اور راٹھوڑوں سے مقابلہ آرائی کے لیے مغل فوج میں شامل ہوتے رہے، لہذا راجپوت امرا کی مذکورہ دو فی صد تخفیف سے اس بغاوت پر کوئی اثر نہیں ہوا، اس تخفیف کی وجہ یہ تھی کہ اس عرصہ میں مرہٹے اور دکنی ہندو شاہی ملازمتوں میں داخل ہونے لگے تھے۔ شہنشاہ اپنے عہد حکومت کے دوسرے دور میں مرہٹوں، بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں سے مسلسل برسرپیکار رہا، جیسے جیسے دکن کی ان خود مختار ریاستوں کا الحاق مغل سلطنت میں ہوتا گیا، یہاں کے امرا بھی شاہی ملازمتوں میں شریک ہوتے گئے، اور انھیں اعلیٰ درجہ کے مناصب سے سے نوازا گیا، سیاسی حکمت عملی کا بھی یہ لازمی تقاضا تھا کہ مرہٹوں اور دکنی امرا کو اعلیٰ عہدے تفویض کر کے اپنا ہم نوا اور وفادار بنایا جائے، معاند مورخین نے اسے لالچ، طمع اور رشوت سے تعبیر کیا ہے، لیکن قابل لوگوں کو عہدے دینا یا ان کے درجات میں ترقی دینا دائرۂ سیاست کے معائب میں شمار ہوتا ہے، تو اس عیب سے دنیا کے کسی حکمراں کا دامن پاک نہیں ہو سکتا۔

البتہ اس میں سب متفق ہیں کہ اورنگزیب کے عہد حکومت کے نصف آخر میں کوئی راجپوت ہفت ہزاری کے اعلیٰ منصب پر فائز نظر نہیں آتا، کیونکہ اس دور میں مرہٹہ اور دکنی امرا راجپوتوں سے سبقت لے گئے، اس کا دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ جے سنگھ اور جسونت سنگھ کے مرنے کے بعد راجپوتوں میں ایسا کوئی باصلاحیت اور صاحب استعداد راجپوت پیدا نہ ہوا جسے اعلیٰ منصبوں اور اعزاز سے نوازا جاتا، حکومت کے عہدے دار

شجاعت اور کارہائے نمایاں انجام دینے کے صلہ میں ملا کرتے ہیں، نہ کہ وراثت میں، تاہم اورنگزیب قابل راجپوتوں کی ہمیشہ قدر اور حوصلہ افزائی کرتا رہا، ایک موقع پر جب راجہ جے سنگھ ثانی[1] بانی جے پور نے اپنی خورد سالی کے باوجود شہنشاہ کے کسی سوال کے جواب میں اپنی ذہانت و فطانت کا ثبوت دیا، تو اسے ریاست انبیر کی سند جانشینی عطا کرتے ہوئے، سوائی (معمول سے زائد) کے معزز خطاب سے سرفراز کیا، کیونکہ بادشاہ کی نظر میں اس کی ذہانت جے سنگھ اول سے بڑھ کر تھی، اسوقت سے آج تک جے پور کے ہر راجہ کے نام کا پہلا جز "سوائی" ہوتا ہے، اورنگزیب کے راجپوت نوازی صرف ملازمت اور مناصب دینے تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ انھوں نے نہ تو کبھی کسی راجپوت ریاست کا اپنی مملکت میں الحاق کیا، نہ ان کی جاگیریں واپس لیں، یہاں تک کہ جسونت سنگھ جیسے عیار شخص کی جاگیر مارواڑ کو ہاتھ نہیں لگایا، اس کے علاوہ اس کی جاگیر میں حصار کا علاقہ بھی تھا، جسے بعد میں گجرات میں شامل کر دیا گیا، دوسرے راجپوت زمینداروں کے ساتھ بھی وہ الطاف و اکرام اور مراحم خسروانہ سے پیش آتا رہا، البتہ یہ ضرور ہوا، کہ انھیں ترقی دینے کی صورت میں صرف وطن میں جاگیریں ہی دی گئیں اور شاہی جاگیریں عطا کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی، اس کی وجہ یہ تھی؛ دکنی امرا اور

---

[1] جے سنگھ ثانی (۳ دسمبر ۱۶۸۸ء تا ستمبر ۱۷۴۳ء) کا ابتدائی نام وجے سنگھ اور اس کے چھوٹے بھائی کا نام جے سنگھ تھا، جو انبیر کے زمیندار بشن سنگھ کا بیٹا تھا، باپ کے انتقال کے بعد جب وہ ریاست کی سند حاصل کرنے اورنگزیب کے دربار میں پہنچا، تو دربار برخاست ہو چکا تھا، اطلاع ملنے پر بچہ کو اندر بلا لیا گیا، اس وقت شہنشاہ اس کی حاضر جوابی سے بہت خوش ہوا، اور اس کا نام بدل کر "سوائے جے سنگھ" رکھ دیا، کیونکہ وہ ذہانت میں مرزا راجہ جے سنگھ اول سے بڑھ کر تھا، یعنی شاہنشاہ اپنے امرا کی ذاتی استعداد کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے انھیں ایسے مناسب خطابات سے نوازتے

مرہٹہ سرداروں نے شاہی ملازمتیں اختیار کرلی تھیں، ان کے پاس راجپوت زمینداروں کے مانند آبائی عملداریاں نہ تھیں، لہٰذا ان (مرہٹوں اور دکنی امراء) کو خدمات کے صلہ میں جاگیریں دی جاسکتی تھیں، تاہم انتظامی امور کی ان دشواریوں کے باوجود اورنگزیب نے راجپوتوں کے ساتھ دوسرے ہندو راجاؤں کی بہ نسبت زیادہ اچھا سلوک کیا، ایسے راجپوتوں کو جو شاہی ملازمت میں تھے، جزیہ سے بری الذمہ کردیا گیا، اور ان کی قابلیت کے مطابق انھیں شاہی الطاف و اکرام سے نوازا جاتا رہا، یہاں تک کہ جب انبیر کا زمیندار اور عمدۃ الملک راجہ جے سنگھ کو اس اعلیٰ شاہی منصب سے نوازا گیا، جو شہزادوں کے منصب کے بعد سب سے بڑا اعزاز تھا، تو اس کی بیش بہا خدمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اسے انعامی جاگیر سے بھی سرفراز کیا گیا، یہ انعامی جاگیر (جاگیر) صرف ان ہی لوگوں کو دی جاتی تھی، جن پر کسی فرض کی انجام دہی عائد نہ ہوتی تھی، سورت کا شہر جہاں آرا بیگم کو انعام جاگیر میں ہی ملا تھا، درحقیقت انعامی جاگیر صرف شہزادوں اور شہزادیوں کیلئے ہی خاص تھی، راجپوتوں کے علاوہ اورنگزیب کے مرہٹہ منصبداروں کے فی صد تناسب پر بھی طائرانہ نگاہ ڈالنا ضروری ہے، تاکہ اس کے تمام ہندو منصب داروں کے اعداد و شمار سامنے آجائیں، شاہجہاں کے اوائل عہد حکومت سے ہی مرہٹوں کو مغل امراء کی صف میں شامل ہونے کے مواقع فراہم ہونے لگے تھے، چنانچہ اس کے عہد حکومت کے اواخر میں مغل طبقۂ امراء میں مرہٹوں کا تناسب دو اعشاریہ نو فیصد ہوگیا تھا، لیکن اورنگزیب کے دور حکومت کے نصف اول میں مرہٹوں کا تناسب پانچ اعشاریہ پانچ فیصد اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۹) جو ان کی شخصیت، اور ذاتی اوصاف کا آئینہ دار ہوتے تھے، بہر حال اس وقت سے جے پور کے ہر راجہ کے نام کا پہلا جزو "سوائی" ہوتا ہے جے پور اسی راجہ نے بسا کر اپنی راجدھانی بنایا

نصف آخر میں سولہ اعشاریہ سات فی صد ہوگیا تھا، ان میں تین ہزاری اور اس سے بلند تر درجات کے منصب دار جو امرائے اعظم کے زمرہ میں شمار ہوتے تھے وہ یہ ہیں، راجہ ساہو پسر سمبھاجی ولد سیواجی سات ہزاری، سمبھاجی اور کانہوجی شرکے چھ چھ ہزاری، اچلاجی، نمبالکر ناگوجی مانے، بہراجی پاندھرے، سوم شنکر، راناجی جنار دھن، جنکوجی، مالوجی، ستواجی دنلے بیتھوجی (بعد از قبول اسلام محمد قلی خان) پانچ پانچ ہزاری، جادون رائے دکنی، داماجی، ہرسوجی بیتونت رائے، باجی چوان دنلے اور سیاجی چار چار ہزاری، نیز دیگر چند مرہٹے ساڑھے تین ہزاری اور تقریباً تیرہ مرہٹے تین تین ہزاری منصب دار تھے، سیواجی کے بیٹے سمبھاجی اور پوتے ساہو کے علاوہ اس کے بعض دیگر خویش و اقارب بھی مغل حکومت کی ملازمت اختیار کیے ہوئے تھے، مثلاً مہادجی، نمبالکر جو سیواجی کا داماد تھا، اورنگزیب کے کمانڈر دلیر خاں کے ماتحت مغل منصبدار تھا، اس کے ساتھ سمبھاجی کی ہمشیرہ شکوار بائی عرف سکھو بائی جو سیواجی کی بیوی سئی بائی کے بطن سے تھی، بیاہی گئی تھی، شر کے خاندان کے کئی افراد اورنگزیب کے منصب دار تھے، یہ شر کے سیواجی کے سسرالی خاندان کا ایک فرد تھا، سیواجی کے داماد مہادجی کا باپ باجاجی نمبالکر بھی شاہی ملازمت میں تھا، اس نے بعد میں اسلام قبول کرلیا،

اس طرح یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ راجپوت اور مرہٹے سمیت اورنگزیب کے کل منصب داروں میں ہندو امراء اکثریت میں تھے، کیونکہ اس کی حکومت کے نصف اول میں چار سو چھیاسی منصبداروں میں ایک سو پانچ یعنی اکیس اعشاریہ چھ فی صد ہندو تھے اور دوسرے دور حکومت میں پانچ سو پچھتر امراء میں ایک سو بیاسی یعنی اکتیس اعشاریہ چھ فی صد ہندو اعلیٰ و برتر مناصب پر فائز تھے، گویا دونوں ادوار میں اوسطاً

ستائیس فیصد ہندو امراء تھے، اس کے باوجود معاندین اس پر یہ الزام عائد کرتے رہتے ہیں
کہ اس نے بیک جنبشِ قلم ہندوؤں کو سرکاری ملازمتوں سے خارج کر دیا تھا، اس الزام
کی حقیقت صرف یہ ہے، کہ اس نے ۱۶۷۱ء میں یہ حکم صادر کیا کہ محکمۂ مالگذاری سے صرف
وہ ہندو منشی (کلرک)، دیوان اور عامل برطرف کر دیے جائیں، جو مرتشی (رشوت خور) ہوں،
لیکن جلد ہی اس حکم میں یہ ترمیم کر دی گئی کہ محکمۂ مالیات میں نصف پیشکار ہندو اور نصف
مسلمان رکھے جائیں ظاہر ہے کہ اس فرمان کا مقصد رشوت ستانی کا خاتمہ کرنا تھا، جس میں
کسی تعصب و تنگ دلی و تنگ نظری کو دخل نہ تھا، مورخ سرجدوناتھ سرکار (متوفی ۱۹۵۸ء)
نے لکھا ہے، کہ اورنگزیب کی تخت نشینی کے بعد محکمۂ مالگذاری کا سارا نظم و نسق راے رایان
رگھوناتھ[۵] کے سپرد تھا، جو نہایت ایماندار اور کاشتکاروں کا ہمدرد تھا، اورنگزیب
نے اسے راجہ کے خطاب سے سرفراز کیا، لیکن مورخ موصوف نے حسب عادت ایک ہی
جملہ میں نہایت چابکدستی سے یہ متضاد بات بھی کہہ دی کہ راجہ رگھوناتھ حین حیات نائب
دیوان ہی بنا رہا، دیوان اعلیٰ کبھی نہ بن سکا، حالانکہ وہ عمر بھر دیوان اعلیٰ کے سارے
فرائض انجام دیتا رہا[۶]، لیکن اس بات سے وہ اورنگزیب پر جانبداری کا الزام عائد
نہیں کر سکے،

---

۵ راجہ رگھوناتھ اولاً علامی سعد اللہ خان شاہجہانی کے انتقال (۷ اپریل ۱۶۵۶ء)
سے ۲۰ جولائی ۱۶۵۶ء یعنی اس عہدہ پر میر جملہ کی تقرری تک تین ماہ اور بعد ازاں ۱۶۵۸ء
سے حین حیات (۱۶۶۳ء تک)، نائب دیوان کی حیثیت سے اس اہم ترین محکمہ کے بلاشرکت غیرے
تمام فرائض انجام دیتا رہا، ملاحظہ ہو "مغل ایڈمنسٹریشن"۔ ص ۲۸-۳۰ ہندی اڈیشن مطبوعہ ۱۹۷۰ء
از پروفیسر جادوناتھ سرکار، ۶ ہسٹری آف اورنگزیب ج ۳ ص ۶۲ از پروفیسر جدوناتھ سرکار۔

اورنگزیب کے ہندو امراء کی تعداد کے مذکورۂ بالا اجمالی جائزے کے بعد اس بیان
میں کیا صداقت باقی رہ جاتی ہے کہ "اکبر نے راجپوتوں کا تعاون اور ان کی ہمدردیاں حاصل
کر کے ان کو حسب قابلیت اعلیٰ مناصب اور عہدے عطا کیے[۱]، اس کے برخلاف اورنگزیب
نے راجپوتوں سے عداوت پیدا کر لی اور انھیں نیز غیر ہندوؤں کو شاہی ملازمتوں سے موقوف
کر دیا[۲]، اسی طرح جب ڈاکٹر اشیری وادی لال سری واستو سابق صدر شعبۂ تاریخ آگرہ
یونیورسٹی اورنگزیب کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ "محمد علی جناح کے ماسوا اورنگزیب جیسا
کوئی دوسرا شخص پیدا نہیں ہوا، جس نے اس ملک کے باشندوں کی دو اہم ذاتوں (ہندو
اور مسلمان) میں تفریق کی خلیج کو اتنی وسیع کیا ہو[۳]، تو اس سے ان کے قول کا صرف سطحی پن
ہی ظاہر ہوتا ہے۔

یہاں اورنگزیب کے ہم عصر سیواجی کے مسلم افسران و ملازمین اور اس کی مذہبی پالیسی کے بارے
میں بھی اشارہ کرنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ "وہ سرکاری ملازمتیں
تفویض کرتے وقت مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کا امتیاز نہیں برتتا تھا، علی الخصوص انھیں
فوج اور بحری بیڑہ میں ذمہ دار عہدوں پر تعینات کیا کرتا تھا، تمام لوگوں کو بلا امتیاز
مذہب و ملت اس کی ملازمت حاصل کرنے کے یکساں مواقع فراہم تھے اور وہ ہندو و سادھو

---

۱ یہ اور بات ہے، کہ اس وسیع النظر اکبر کے امرائے اعظم میں ہمیں صرف ایک راجپوت یعنی
راجہ مان سنگھ زمیندار امبیر ہی ہفت ہزاری منصب پر فائز نظر آتا ہے جبکہ "متعصب
اور تنگ نظر" اورنگزیب کے یہاں ہفت ہزاری منصب پر دو راجپوت (جے سنگھ و جسونت
سنگھ) اور ایک مرہٹہ یعنی ساہو پسر سمبھا دکھائی دیتے ہیں۔ ۲ بھارت کا برہت اتہاس ج ۲
ص ۱۷۸ طبع سوم از ڈاکٹر سری نیتر پانڈے، ۳ مغل کالین بھارت ص ۱۹۱ مطبوعہ ۱۹۶۵ء از ڈاکٹر اے۔ ایل
سری واستو۔

سنتوں کے ساتھ مسلم بزرگوں کا بھی احترام کرتا تھا، مسلم رعایا کو مرہٹہ راج میں اپنے عقائد کے مطابق زندگی بسر کرنے میں کوئی خطرہ لاحق نہ تھا، جیسا کہ اورنگزیب کی کٹر مسلم حکومت میں ہندوؤں کے لیے تھا، اور اس (شیواجی) کی مذہبی پالیسی نہایت روادارانہ تھی۔[۱] سرجدو ناتھ سرکار نے اورنگزیب اور اس کے پہلو بہ پہلو شیواجی پر تحقیقی کام کرنے میں اپنی عمر عزیز کے تقریباً ۲۵ سال صرف کرکے تحقیق و جستجو کی دنیا میں یقیناً ایک عظیم خدمت انجام دی، مگر اپنے ہیرو کی مدح سرائی کرنے کے باوجود ہندو پد پادشاہی کے نمایندہ شیواجی کی فوج میں (جو دو لاکھ پانچ ہزار فوجیوں اور چھیانوے کمانڈروں پر مشتمل تھی)، صرف سات سو بیجاپوری سپاہ کے مفرور اور برخاست شدہ پٹھان فوجیوں کو ہی شمار کرا سکے، اور کمانڈروں میں سیدی جلال اور نور خان اور خارجہ سکریٹری قاضی حیدر کے نام ہی اپنی تصنیف میں پیش کر سکے، لیکن شیواجی کے مسلم ملازمین کی یہ فہرست یقیناً نامکمل رہے گی اگر اس میں اس کے ذاتی خدمت گار فراش مداری مہتر کو شامل نہ کیا جائے، فراش مداری مہتر کے تعاون ہی سے شیواجی آگرہ سے فرار ہوا تھا۔[۲] .....

..... قاضی حیدر کو عربی، فارسی جاننے کے سبب امور خارجہ کا انچارج بنایا تھا۔ (قاضی صاحب نے سمبھاجی کے عہد حکومت میں اس کے مظالم سے تنگ آکر اورنگزیب کی ملازمت اختیار کر لی تھی جہاں وہ دہلی کے قاضی القضاۃ بنائے گئے)، عام طور سے حکومتیں علوم و فنون اور تمام زبانوں کی سرپرستی کیا کرتی ہیں، لیکن سیواجی کو فارسی زبان سے

---

[۱] پاورس آف سیواجی ص ۵۵۳ از سرکار، سیواجی اینڈ ہز ٹائمز از سرکار، ص ۳۹۰، نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز ج ۱، ص ۳۳۰ - ۳۳۵ از جی ایس سردیسائی، فال آف دی مغل امپائر، از سڈنی جے اوون ص ۵۴ طبع ۱۹۶۰ء ہسٹاریکل الیسیز از قانون گو۔ ص ۱۰۲۔ [۲] شیواجی اینڈ ہز ٹائمز ص ۳۵۹

انتہائی نفرت تھی، اور اسے وہ غلامی کی علامت سمجھتا تھا، لہذا اس نے سنسکرت زبان کو اپنی سرکاری و دفتری زبان بنانے کیلیے رگھوناتھ پنت ہنومنتے کی سرکردگی میں پنڈتوں کی ایک جماعت سے "راج بیوہار" نام کا ایک فرہنگ تیار کرایا۔[۱] اور فارسی کو اپنی حکومت سے جلاوطن کر دیا، بحری فوج کی سربراہی مسلمانوں کے سپرد کرنا سیواجی کی مجبوری تھی، کیونکہ اسوقت عام ہندو بحری سفر کو "مہا پاپ" سمجھتے تھے، جہاں تک مسلم بزرگان دین کے احترام کا سوال ہے تو بقول مرہٹہ مورخ گووند سکھا رام سردیسائی ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ سیواجی کیلسی کے بزرگ بابا یاقوت کو اپنا "دھرم گرو" مانتا تھا، مگر نومبر ۱۶۵۹ء میں جلف

....

نواح میں شیخ جان محمد کی خانقاہ کو سیواجی تاراج کرتا ہوا نظر آتا ہے، یہاں تک کہ اس عمر رسیدہ بزرگ کو اس نے ڈرایا۔ دھمکایا اور ہتک آمیز سلوک کرتے ہوئے انھیں گالیاں تک دیں، کہا جاتا ہے کہ اس کی اس بدسلوکی سے کبیدہ خاطر ہو کر شیخ علیہ الرحمہ نے اسے بددعا دی، جس کے نتیجہ میں وہ (سیواجی) پانچ ماہ بعد ۴ اپریل ۱۶۸۰ء کو اپنی خانگی زندگی اور بیوی بچوں سے تنگ آکر نہایت مایوس کن حالات میں اس دنیا سے کوچ کر گیا۔[۲]

دراصل سیواجی کی نگاہیں روز اول سے ہندو دھرم کے احیاء عظیم منصوبہ پر مرکوز تھیں، چنانچہ وہ نومسلموں کو حرص و طمع اور ترغیب و ترہیب کے ذریعہ از سر نو شدھی کر لیا کرتا تھا بالاجی نمبالکر اور نیتاجی پالکر اس کی مثال ہیں۔[۳] وہ خود کو گائے اور برہمن کا محافظ خیال کرتا تھا

---

[۱] نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز (ہندی ایڈیشن۔ ج ۱ ص ۲۶۵، ۳۳۵) [۲] اے شارٹ ہسٹری آف اورنگزیب (ہندی)، ص ۳۰۶۔ نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز ص ۳۱۶، سیواجی اینڈ ہز ٹائمز ص ۳۲۷۔ ۸، دی ملٹری سسٹم آف دی مرہٹاز، از ڈاکٹر سریندر ناتھ سین، ص ۱۰۸ حاشیہ نمبر ۲ [۳] نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز۔ ص ۳۳۵ و ۳۵۵

جیسا کہ مغرور مغل منصب دار پھر سال بندیلہ سے ملاقات میں اس کی جذباتی اور اشتعال انگیز گفتگو سے ثابت ہے[1] کچھ تو پیدائشی طور پر اور کچھ ماحول کے افراط کے تحت وہ اتنا متعصب اور کٹر قسم کا ہندو واقع ہوا تھا کہ خود اپنے باپ شاہ جی کو محض اس لیے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا کہ وہ رندولہ خان کی ماتحتی میں بیجاپور میں ملازمت اختیار کیے ہوئے تھا، بیجاپوری سلطنت کے ساتھ شاہ جی کی وفاداری اور خدمات کے پس منظر میں پیشواؤں کی اتہاس (۱۶۸۳ء) میں نانا فرنویس رقم طراز ہیں "کہ شاہ جی نے بھارت کو ایک مسلم ملک بنانے میں اور ہندو دھرم کے استیصال میں ترکوں سے تعاون کر کے جو ذلیل وکمینہ برتاؤ (آچرن) کیا وہ بھگون کو بھی اچھا نہ لگا[2]، ایسی تاویلوں کے بعد بھی سر جدوناتھ سرکار کو اپنے آنجہانی ممدوح کے اس مذہبی کٹرپن کے بارہ میں یہ کہنا پڑا کہ سیواجی کے ہندوسوراج کا آدرش جس مقدار میں (ہندو) کٹرپن پر منحصر تھا، اسی تناسب سے اس کی تباہی اور شامت کے بیج اس میں مضمر تھے، (سیواجی اینڈ ہز ٹائمس ص ۳۷۵، چھٹا اڈیشن)

اورنگزیب کے امرا میں غیر مسلم منصب داروں کے اعداد وشمار کی وضاحت کے بعد اس کے ایرانی امرار (شیعی) کے فی صد تناسب اور حیثیت پر بھی مختصر طور پر روشنی ڈالنا ضروری ہے تاکہ ملازمتیں وغیرہ تفویض کرنے کے سلسلہ میں اس کی مذہبی رواداری کی تصویر سامنے آسکے۔ اکثر ہندو مورخین نے اسے "ہندوکش" ہونے کے ساتھ رافضی کش[3] بھی بتلایا ہے، نیز یہ کہ وہ انھیں بالعموم "ایرانی غول بیابانی" کے الفاظ سے یاد کرتا تھا اور انھیں شدید نفرت

---

[1] دی ملٹری سسٹم آف دی مرہٹاز ص ۱، حاشیہ نمبر ۲ [2] میں کر ہسٹری آف مرہٹہ ہسٹری (ازجی ایس سردیسائی ص ۱۳ و ۱۴ [3] ہندوی سوراج کی اصطلاح سیواجی نے اپنے ان مراسلہ میں استعمال کی ہے جو انھوں نے دادوجی نرس پربھو کو ارسال کیا تھا دیکھیے دی ملٹری سسٹم آف دی مرہٹاز از ڈاکٹر سریندر ناتھ سین ص ۱، مطبوعہ اکتوبر ۱۹۵۸ء [4] سر جدوناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ جب کسی امیر نے رافضی کش نام کا ایک

حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا، کیونکہ ان کے نزدیک اہل تشیع اسلام دشمن تھے[1]، اس پر یہ بھی الزام ہے کہ جانشینی کی جنگ میں اس نے سنیوں کو اہل تشیع کے بالمقابل کمربستہ اور برسرپیکار کر دیا تھا، لیکن کل منصب داروں کے اعداد وشمار پر نظر کرنے کے بعد نہ تو یہ دعویٰ قابل قبول ہو سکتا ہے اور نہ ان کی شیعہ دشمنی ثابت ہوتی ہے، کیونکہ جنگ سموگڈھ (مئی ۱۶۵۸ء) سے قبل ایک ہزاری اور اس سے بلند تر درجات کے ۲۴ منصبداروں میں ۲، یعنی ۱۲ عشاریہ ۵ فی صد ایرانی امرار اورنگزیب کے طرفدار تھے، ان میں چار کا منصب پانچ ہزاری اور اس سے بلند تر تھا، جن میں اس کا ماموں امیر الامرار مرزا ابوطالب شایستہ خان اور محمد سعید میر جملہ سات سات ہزاری ذات وسوار اور دو اسپہ سہ اسپہ منصب پر فائز تھے، یہ دونوں سموگڈھ کے معرکہ میں اورنگزیب کے کماندار تھے، دوسری طرف شہزادہ بلند اقبال داراشکوہ کے ۸۰ منصب داروں میں ۲۳ (۷ء۲۶ فی صد) ایرانی تھے، یعنی اورنگزیب کے شیعی امرار سے صرف چار عشاریہ آٹھ فی صد زائد۔

تخت نشینی کے بعد بھی شاہی ملازمت میں ایرانیوں کی عددی قوت اور ان کے مناصب ودرجات پر کوئی اثر نہ پڑا، اور ان کی حیثیت بدستور قائم رہی، برنیر نے بھی اپنے سفرنامہ میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اورنگزیب کے غیر ملکی امرار کا معتدبہ حصہ ایرانیوں پر مشتمل ہے، برنیر کے اس قول میں مبالغہ آرائی کو دخل نہیں ہے، کیونکہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ) بیش قبض (خنجر) شہنشاہ کے حضور پیش کیا تو اورنگزیب نے اظہار مسرت فرماتے ہوئے اسی قسم کے کچھ اور خنجر تیار کرانے کا حکم صادر فرمایا، ملاحظہ ہو، مغل ایڈمنسٹریشن (ہندی) ص ۱۲۷ مطبوعہ سنہ ۱۹۶۰ء [1] ایضاً ص ۱۲۶ نیز انیکڈوٹس آف اورنگزیب صفحات ۱۲۷ تا ۱۲۵۔

اورنگزیب کی حکومت کے نصف اول میں ۴۸۶ منصب داروں میں ۱۳۶ (تقریباً ۲۸ فیصد) ایرانی امراء تھے، جب کہ تورانیوں (سنیوں) کی تعداد ۷۰ یعنی صرف ۱۳ فی صد تھی، اس معمولی تخفیف کا سبب یہ تھا کہ مرہٹوں کی وجہ سے اورنگزیب کے دونوں دور حکومت میں تورانی (سنی) علی الترتیب تیرہ اور بارہ فی صد رہے تھے، گویا تورانیوں کی تعداد اورنگزیب کے پورے عہد حکومت میں کم رہی، عصری سیاح ٹیورنیر کا بیان ہے کہ مغل مملکت میں ایرانی بلند ترین عہدوں پر فائض ہیں ٹیورنیر کا بیان اس لیے صداقت پر مبنی ہے کہ اورنگزیب کے اول دور حکومت میں ۲۳ ایرانی پنج ہزاری یا اس سے بلند تر منصب پر فائز تھے، جب کہ تورانی صرف ۹ ہی تھے، اور دور آخر میں بلند ترین عہدوں پر ۱۴ ایرانی تھے، جب کہ تورانی صرف چھ ایرانیوں کی اس بہتر پوزیشن میں ہونے کے مختلف وجوہ تھے، اولاً دکن کی خود مختار شیعی ریاستوں کا مغل امپائر سے الحاق تھا، جس کے نتیجہ میں شیعی امراء شاہی ملازمت میں شریک ہو گئے، ثانیاً ایرانی تورانیوں اور افغانوں کے بہ نسبت زیادہ مہذب ہوتے تھے، افاغنہ (پٹھانوں) کو مغل تہذیبی اعتبار سے نہایت پست اور حقیر خیال کرتے تھے، بادشاہ بابر کا قول ہے کہ یہ پٹھان بڑے گنوار اور جاہل ہیں[1]، ثالثاً اورنگزیب اہل خواف (ایران کے صوبہ خواف کے باشندوں) پر حد درجہ اعتماد کرتا تھا، اس دعوے کی تائید میں یہاں میرک معین الدین احمد خوافی کا نام پیش کیا جا سکتا ہے، امیر موصوف کا شمار اورنگزیب کے انتہائی معتمد علیہ امراء میں ہوتا ہے، کابل و دکن کی دیوانی کے فرائض نہایت حسن تدبیر سے انجام دیتے ہوئے میرک معین الدین نے ۱۰۹۵ھ میں رحلت فرمائی، "سید بہشتی شد" سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے[2]، اورنگزیب کے دور فرمان روائی میں ایرانی امراء کی حیثیت دیگر

---

[1] تزک بابری اردو ترجمہ ص ۲۶۲ مطبوعہ ۱۹۶۰ء [2] میرک معین الدین احمد خوافی کے

(بقیہ حاشیہ آگے صفحہ پر)

نسلوں ذاتوں اور فرقوں کے مقابلہ میں بہتر و برتر ہونے کے باوجود سرجدوناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ "ایرانیوں کے سلسلہ میں اورنگزیب کا طبعی عدم اعتماد اس کے سارے امور جہانبانی میں مسلسل سد راہ بنا رہا"[1]، لیکن اس کے برعکس تاریخی شواہد اور خود مورخ موصوف کی تحقیقات ہی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایرانی امراء کے بلند مراتب پر بادشاہ کے نہایت متشرع ہونے کے باوجود کوئی اثر نہیں پڑا، چنانچہ ایک دفعہ بادشاہ کے حضور شکایت کی گئی کہ بخشی الممالک شیعہ ہے، لیکن اس نے کسی اور کا تقرر کرنے سے انکار کر دیا کہ اس کے دور حکومت کی بیشتر مدت میں بخشی الممالک کے عہدہ پر شیعہ ہی فائز رہے، مثلاً سربلند خان (م ۱۶۷۹ء) ۱۶۶۲ء میں بخشی دوم اور پھر بخشی الممالک کے عہدہ پر سرفراز کیا گیا، اس کے بعد روح اللہ خان پسر خلیل اللہ خان جنوری ۱۶۸۰ء تا ۱۶۹۲ء اس اہم ترین عہدہ پر تعینات رہا، میر حسن خانزادگان عرف روح اللہ خان ثانی جس نے ۱۷۰۴ء میں عین عالم شباب میں انتقال کیا، ۱۶۹۲ء میں بخشی دوم اور اپنی وفات کے وقت خانساماں[2] کے معزز عہدہ پر مقرر تھا، مخلص خان پسر صف شکن خان متوفی ۱۷۰۱ء بہرہ مند خان متوفی ۱۷۰۲ء اور مرزا صدر الدین خان صفوی جسے بہادر شاہ اول کے دور حکومت میں شاہ نواز خان کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۷) سوانحی حالات اور انکی خدمات کے لیے ملاحظہ ہو مکتوبات خواجہ احمد معصوم سرہندی تلخیص و ترجمہ حضرت مولانا مفتی نسیم احمد صاحب امروہوی ص ۴۶ تا ۵۰ حاشیہ نمبر ۱ مطبوعہ ستمبر ۱۹۶۰ء

[1] ہسٹری آف اورنگزیب (ہندی) ص ۳۶۱ طبع ستمبر ۱۹۵۱ء [2] مغل عہد حکومت میں خانساماں یا میر ساماں انتہائی اہمیت کا حامل عہدہ تھا، جس کے تحت شاہی محل و حرم، مطبخ اور شاہی کارخانوں کا انتظام و انصرام نیز شہنشاہ کی حفاظت کا ذمہ ہوتا تھا، وہ شہنشاہ کے سفر و حضر اور خلوت میں سایہ کی طرح ہمیشہ ساتھ رہتا تھا اور خانگی عملہ بھی اسی کی ماتحتی میں اپنے فرائض انجام دیتا تھا، دیوان اعلیٰ (وزیر اعظم) کے بعد یہ دوسرے درجہ کا عہدہ تھا، چنانچہ یہ عہدہ نہایت با اثر اور معتمد علیہ شخصیت کے سپرد کیا جاتا تھا۔ ملاحظہ ہو، مغل ایڈمنسٹریشن از جادو ناتھ سرکار

خطاب دیا گیا، بخشی گری کے عہدہ پر فائز ہوئے[1]، ان کے علاوہ بہت سے ایرانی (شیعی) دوسرے اعلیٰ تر اور بلند تر مناصب پر فائز تھے، مثلاً رعد انداز خاں جسے ستنامیوں کی بغاوت کو فرو کرنے کے صلہ میں شجاعت خاں کے خطاب سے نوازا گیا، قلعہ اکبرآباد کا کمانڈنٹ اور پانچ ہزاری منصب دار تھا، اس کے کارہائے نمایاں سے عہد عالمگیر کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ ۱۶۷۴ء میں افغانوں سے داد شجاعت دیتا ہوا کرّاپا درہ میں مارا گیا، عمدۃ الملک جعفر خان اورنگزیب کا وزیر اور اسکا لڑکا کامگار خان ۱۶۸۷ء میں عہدہ خان سامان پر مامور تھا، عنایت اللہ ... جو اورنگزیب کا سکریٹری تھا ۱۶۱۲ء میں دیوان تن اور ۱۶۹۸ء میں دیوان خالصہ کے عہدہ پر تعینات کیا گیا، اسی طرح موسوی خان عرف مرزا معز فطرت ہم زلف اورنگزیب ۱۶۹۹ء میں دیوان تن اور پھر دکن کا دیوان بنایا گیا، میر ملک حسین خان جہاں کوکلتاش ظفر جنگ اورنگزیب کے اعلیٰ ترین امراء میں تھا، جس نے ایک عرصہ تک نمایاں خدمات انجام دیں، حافظ محمد امین خان پسر میر جملہ جو نہایت غالی شیعہ تھا ۱۶۷۲ء سے اپنی وفات ۱۶۸۲ء تک گجرات کا صوبیدار رہا، اور بزرگ امید خان پسر شائستہ خان فاتح چٹگام و آسام ۱۶۸۲ء سے ۱۶۹۲ء تک بہار کا گورنر تھا، غازی الدین بہادر فیروز جنگ اورنگزیب کے سپہ سالاروں میں امتیازی شخصیت کا حامل تھا، ۱۶۸۵ء میں محاصرہ بیجاپور کے دوران شہزادہ اعظم اور اس کی سپاہ کو نیست و نابود اور تباہ ہونے سے بچانا اسی فیروز جنگ کی حوصلہ مندی اور سوجھ بوجھ کا کام تھا، شہنشاہ اورنگزیب کے امیر عسکر اور مصاحب خاص عاقل خان رازی کے بارہ میں کچھ کہنا تحصیل حاصل ہوگا کہ اس کی شخصیت سے مغل تاریخ کی ابجد قوال بھی واقف ہے، اورنگزیب کے ایرانی امراء میں سات ہزاری منصب داروں کی

[1] اینگ ڈوٹس آف اورنگزیب ص ۸۲۔

تعداد چھ تھی، جب کہ شاہجہانی عہد حکومت کے اواخر میں شاہی خاندان کے باہر سات ہزاری ذات و سوار کا معزز منصب صرف تین امراء یعنی علی مردان خاں، سعید خاں اور اسلام خان کو نصیب ہوا، جن میں صرف اول الذکر ہی شیعہ تھا، آصف خاں کو جو نو ہزاری ذات و سوار کا منصب دار تھا، اس تقسیم سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیے، کیونکہ وہ شاہجہاں کا خسر تھا، جس نے شاہجہاں کو اورنگ نشین سلطنت کرانے میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں[1]، اس کے برعکس "رافضی کش" اورنگزیب کے شیعی امراء میں شائستہ خان میر ملک حسین کوکلتاش، خان خانان میر جملہ اور محمد ابراہیم خلیل اللہ خاں عرف مہابت خاں سات سات ہزاری ذات و سوار اور دو اسپہ سہ اسپہ نیز محمد ابراہیم اسد خاں اور عزیز الدین بہرہ مند خان سات سات ہزاری ذات کے منصب دار تھے، اگر ان سات ہزاری امراء کی فہرست میں دکن کے دو امراء نواب عبدالروف خان میانہ[2] عرف

[1] ہسٹری آف شاہجہاں آف دہلی، از ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ ص ۲۸۰ مطبوعہ ۱۹۵۸ء

[2] میانہ قبائل افغانستان میں سے ایک قبیلہ کا نام تھا، اس قبیلہ کا مورث اعلیٰ حسن خان میانہ جہانگیری دور حکومت میں وارد ہندوستان ہوا، دربار میں رسائی حاصل کرکے دکن میں کسی عہدہ پر مامور ہو گیا، نواب عبدالروف خاں میانہ خان موصوف ہی کے احفاد میں سے تھا۔ جو دکن کی عادل شاہی حکومت میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھا۔ ۱۶۸۶ء میں اس ریاست کے مغل (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۲ پر)

دلیر خان اور سید مخدوم عرف شرزہ خان بعدہ رستم خان مہدوی کو بھی شریک کر لیا جائے، جو مغل سلطنت میں دکن کی شیعی ریاستوں کے انضمام کے بعد آئے تھے، تو یہ تعداد آٹھ ہو جاتی ہے۔ (باقی)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۱) سلطنت میں انضمام کے بعد نواب موصوف نے اورنگزیب کی ملازمت اختیار کر لی، شہنشاہ نے اسے سات ہزاری منصب اور دلیر خان کے خطاب سے نوازا، مختلف مقامات پر شاہی خدمات انجام دیتے ہوئے بعہد بہادر شاہی ۱۷۱۱ء میں راہی ملک عدم ہوئے، سلہ مہدوی فرقہ سید میر محمد جونپوری متوفی ۹۱۰ھ/۱۵۰۵ء کی طرف منسوب ہے، کہا جاتا ہے کہ وہ مہدی ہونے کے مدعی تھے، سترہویں صدی کے وسط تک اس فرقہ کے باقیات بیجاپور میں موجود تھے۔ اس فرقہ کے بانی اور انکے حالات زندگی کے لیے دیکھئے "تذکرہ" مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم۔ مرتبہ جناب مالک رام صاحب صفحہ ۴۳ نیز ۶۴ تا ۷۳۔ اور صفحہ ۳۵، حاشیہ نمبر ۲ مطبوعہ ۱۹۸۱ء ہاؤس آف سیوا جی۔ ص ۹۹-۹۸۔

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

جلد سوم

اس میں اورنگزیب عالمگیر، اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ (از سید صباح الدین عبدالرحمٰن)

قیمت ؍۔ ۳۸ روپے۔ منیجر

مطبوعات جدیدہ

احکام القرآن:۔ مولفہ چودھری نذر محمد صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۹۷۶، مجلد قیمت درج نہیں، پتہ۔ سروس انڈسٹریز لمیٹڈ، گلبرگ، لاہور، پاکستان۔

اس ضخیم کتاب میں مختلف نوعیت کی قرآنی تعلیم وہدایت کو ۱۳ جامع عنوانات کے تحت پیش کیا گیا ہے، ہر عنوان کے تحت متعدد ذیلی عنوانات بھی ہیں، مصنف ایک کامیاب تاجر ہیں، وہ عربی زبان سے بھی ناواقف ہیں، لیکن اپنے دینی ذوق اور قرآن مجید کے احکام کے مطابق زندگی گذارنے کے جذبہ وداعیہ کے ماتحت اردو ترجموں اور اردو کتب و تفسیروں کی مدد سے جب اس کا مطالعہ شروع کیا تو اس سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے قرآنی ہدایات واحکام کو نوٹ کی صورت میں قلمبند کرنا شروع کیا، یہ کام اتنا پھیلا کہ یہ ضخیم مجموعہ مرتب ہو گیا، جس کو عام فائدہ کے لیے شائع کیا گیا ہے، آیتوں، سورتوں اور پاروں کے حوالے بھی دیے گئے ہیں، کتاب کے نام سے خیال ہوتا ہے کہ یہ صرف احکامی آیتوں کے ترجمے پر مشتمل ہوگی، مگر لائق مصنف نے اس کا دائرہ بہت وسیع کر دیا ہے، اور یہ عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، اجتماعیات، سیاسیات، معاشیات، معاشرت وتمدن، دعوت وتبلیغ اور شرک ونفاق وغیرہ ہر طرح کے مضامین کی آیتوں کے ترجمے کا مجموعہ ہے، انھوں نے ضخامت سے بچنے کے لیے متن کے بجائے صرف آیتوں کے ترجمے نقل کر دینے پر اکتفا کیا ہے اس کو

عموماً خلافِ احتیاط کہا جاتا ہے، اس کی اور بغیر کسی تشریح کی وجہ سے محض ترجمے سے جا بجا اصل مدعا واضح نہیں ہو سکا ہے، خصوصاً اردو داں طبقہ کو سمجھنے میں اور بھی دشواری ہو گی، اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ "کیونکہ قرآن مجید مشہود ہوتا ہے" (صد ۲۳) اس میں اولاً تو فجر کا ترجمہ ہی نہیں کیا ہے، ثانیاً مشہود کا لفظ اردو قارئین کی فہم سے بالاتر ہو (صد ۲۲) "ہر امت کے لیے ایک رسول" کے زیرِ عنوان اس مضمون کی مشہور آیت وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر: ۲۴) کا کوئی ذکر نہیں ہے، اسی طرح صد ۳۹ "دین سے مذاق" کے زیرِ عنوان صرف سورۂ توبہ کی دو آیتوں کے ترجمے دئے ہیں، جب کہ اس مفہوم کی آیتیں دوسری سورتوں میں بھی ہیں، ایک جگہ "گمان و تجسس" کا عنوان قائم کیا ہے، (صد ۴۳) ظن، گمان اور تخمین اور چیز ہے، اور ٹوہ اور تجسس دوسری چیز ہے، دونوں کا الگ ذکر ہونا چاہئے تھا، مصنف نے اس کا اہتمام کیا ہے کہ ہر عنوان کے تحت پہلے ان سورتوں کی آیتوں کے ترجمے نقل کریں، جو زمانہ کے لحاظ سے پہلے نازل ہوئی ہیں مگر صد ۱۱ پر پہلے سورۃ القلم کی دو آیتوں کا ترجمہ دیا ہے، اور اس کے بعد سورۃ العلق کی آیات کا، حالانکہ سورۂ علق پہلے نازل ہوئی تھی، اس کتاب کی حیثیت قرآنی مضامین کے اشاریے اور انڈکس کی ہے، ظاہر ہے اس طرح کی چیزوں میں کور کسر اور نقص رہ ہی جاتا ہے، تاہم مصنف نے یہ مفید کام اچھے جذبہ سے کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اس کی جزا عطا فرمائے۔

اسلامی اخلاق و آداب:- از مولانا امجد علی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۵۲، قیمت بائیس روپئے ۲۲، پتے (۱) مکتبہ انوار المصطفیٰ ۶/۵-۳-۲۳۲ مغل پورہ حیدر آباد (۲) مکتبہ قادریہ، چریاکوٹ نمبر ۲۷۶۱۲۹ - اعظم گڈھ،

مولانا محمد امجد علی صاحب مرحوم نے "بہار شریعت" کے نام سے ایک ضخیم فقہی کتاب لکھی تھی

اس کے سترہ ۱۷ حصے شائع ہو چکے ہیں، سولہویں حصہ میں اسلامی اخلاق و آداب کی تفصیل قلمبند کی گئی ہے، اب اس کو عام فائدہ اور موجودہ ضروریات کے مطابق علحدہ شائع کیا گیا ہے۔ اس میں اخلاقی و معاشرتی زندگی کے متعلق مختلف عنوانات کے تحت اسلامی تعلیم و ہدایت درج ہے مصنف ہر عنوان کے تحت پہلے اس سے متعلق حدیثوں کے اردو ترجمے نقل کرتے ہیں، پھر اس موضوع سے متعلق ضروری فقہی مسائل تحریر کرتے ہیں، بعض عنوانات کے تحت کلام مجید کی آیتیں بھی مع ترجمہ درج ہیں، اس کتاب میں کہیں کہیں شدت اور نامناسب طنز و تعریض بھی ہے، نئی ترتیب میں اس طرح کی چیزوں کو حذف کر دینے کی ضرورت تھی تاہم اپنے موضوع پر یہ ایک مفید اور بہتر کتاب ہے۔

اصول الفقہ:- مرتبہ مولوی عبید اللہ الاسعدی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۸۸، قیمت بیس روپیہ ۲۰، پتے (۱) مکتبہ حرا، پوسٹ بکس ۳۴ لکھنؤ، (۲) مکتبہ رحمانیہ، مقام و پوسٹ ہتھورا، ضلع باندہ، یو۔ پی۔

زیر نظر کتاب میں اصولِ فقہ کے مباحث قلمبند کئے گئے ہیں، پہلے اس کی تعریف کر کے اس کے موضوع، غرض، فائدہ اور ضرورت وغیرہ کی وضاحت کی گئی ہے، پھر حکم اور احکام تکلیفیہ و وضعیہ اور ان کے ارکان و اقسام بیان کئے گئے ہیں، اس کے بعد فقہ کی اولین اصل قرآن مجید کے بارہ میں علمائے اصول کی بحثوں کا خلاصہ پیش کیا ہے، اس ضمن میں مختلف حیثیتوں سے مختلف قسموں اور ذیلی قسموں کا تذکرہ کیا ہے، جیسے امر، ادا، قضا، نہی، مطلق، مقید، عام، خاص، مشترک، مؤوّل، ظاہر، نص، مفسر، محکم، خفی، مشکل، مجمل، متشابہ، حقیقت، مجاز، صریح، کنایہ، عبارۃ النص، اشارۃ النص، دلالۃ النص، اقتضاء النص، اور ناسخ و منسوخ وغیرہ نیز ان سب کی گوناگوں قسموں کی تشریح و توضیح کی ہے، پھر دوسری اصل سنت کی تعریف و حجیت اور اس کی بعض قسموں کا تذکرہ

کیا ہے، اس کے بعد اجماع اور قیاس پر گفتگو کی ہے، اور قیاس کے ضمن میں استحسان، استصلاح استصحاب اور آخر میں اجتہاد و تقلید پر بحث کی ہے، اس طرح عربی میں اصول فقہ کی حنفی کتابوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے، کم و بیش اس کا لب لباب اس اردو کتاب میں بھی سلجھے ہوئے انداز میں مناسب ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، گو اس طرح کی اردو کتابوں سے موجودہ زمانہ کے عربی خواں طلبہ مزید کم استعداد اور سہولت پسند ہوتے جا رہے ہیں، تاہم اس سے خود مصنف کی محنت اور اچھی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔

سعادت یار خان رنگین:۔ مرتبہ ڈاکٹر حسن آرزو، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۳۳۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵۰ روپیے، ڈی لکس اڈیشن ۶۰ روپے، پتے (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی (۲)، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔ (۳) نگھار پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن، یو۔پی۔

سعادت یار خان رنگین انشا و جرأت کے معاصر اور اردو کے ممتاز شاعر تھے، وہ ایک خاص صنف شاعری ریختی کے موجد بھی خیال کئے جاتے ہیں، اس کتاب میں ڈاکٹر حسن آرزو صدر شعبۂ اردو و فارسی ایس۔ پی جین کالج سہسرام نے انکی زندگی اور تصنیفات پر بحث و گفتگو کی ہے، یہ چھ ابواب پر مشتمل ہے، شروع میں انکے عہد و ماحول کا جائزہ لیا ہے، اس میں مغلوں کے دور زوال کے واقعات کا خاص طور پر ذکر ہے، اسکے بعد سعادت یار خاں کے بارہ میں انکے معاصر اور بعد کے زمانہ کے مصنفین و ارباب تذکرہ نے جو کچھ لکھا ہے، اسکا خلاصہ پیش کیا ہے، تیسرے باب میں رنگین کے خاندانی و نجی حالات، سیر و سیاحت، مشاغل، انکی سیرت، رنگین مزاجی اور ریختی میں امتیاز کا ذکر ہے، چوتھے باب میں رنگین کے دوستوں اور شاگردوں کا مختصر حال تحریر کیا ہے، پانچویں باب میں رنگین کے دواوین وغیرہ پر تبصرہ کیا ہے، آخر میں رنگین کا منتخب کلام دیا ہے، اس میں اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے کلام کے نمونے بھی آگئے ہیں، رنگین اپنی فحش گوئی اور ریختی نگاری کی وجہ سے زیادہ بدنام ہیں،

اس کی وجہ سے ان کی جانب کم اعتنا کیا گیا ہے، ان پر سب سے بہتر کام ڈاکٹر صابر علی خان مرحوم کا ہے، زیر نظر کتاب بھی محنت سے لکھی گئی ہے اور اول الذکر سے اس میں مدد بھی لی گئی ہے۔

انتخاب ذکاء اللہ:۔ مرتبہ، ڈاکٹر اصغر عباس صاحب، سائز متوسط کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۲۸ مع خوبصورت ٹائٹل، قیمت ۵ روپے

پتہ۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی، بلمرہ ہاؤس، قیصر باغ، لکھنؤ۔

سرسید احمد خاں مرحوم کے رفقا اور ان کی تحریک کے حامیوں میں اردو کے مشہور مصنف و مترجم مولوی ذکاء اللہ دہلوی مرحوم بھی تھے، مستقل تصنیفات کے علاوہ انھوں نے مضامین کا بھی بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے، مگر ان کے اور معاصرین کے مقابلہ میں ان کی جانب کم اعتنا کیا گیا ہے، ان کی متعدد کتابیں تو شائع ہی نہیں ہوئیں اور جو شائع ہوئیں ان کی دوبارہ طبع و اشاعت کی نوبت نہیں آئی، مضامین مختلف رسالوں میں منتشر تھے، اور ان کا بھی کوئی مجموعہ نہیں چھپا تھا، اتر پردیش اردو اکاڈمی نے اردو کے اہم نثر نگاروں کی معیاری کتابوں اور منتخب مضامین کی ترتیب و اشاعت کا منصوبہ بنایا ہے، اسی سلسلہ کی کڑی یہ انتخاب بھی ہے، جس کو ڈاکٹر اصغر عباس استاد شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے مرتب کیا ہے، انھیں سرسید اور انکی تحریک سے اچھی واقفیت بھی ہے، اور وہ اس پر مفید کام بھی کر چکے ہیں، یہ انتخاب چودہ مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں علمی، ادبی اور تاریخی نوعیت کے علاوہ چند انشائیے اور بعض مشہور تصنیفات مقدمہ شعر و شاعری (مولانا حالی) اور سفرنامہ روم و مصر و شام (مولانا شبلیؒ) پر تبصرے شامل ہیں، انتخاب محنت و سلیقہ سے قدیم و کمیاب رسائل کی ورق گردانی کے بعد کیا گیا ہے، شروع میں لائق مرتب کا مقدمہ بھی سلیس، شگفتہ اور متوازن ہے، اس میں مولوی صاحب کے حالات و کمالات کے علاوہ مصنف کی حیثیت سے ان کے درجہ کا تعین کیا ہے اور ان کے اسلوب پر تبصرہ کیا ہے۔ ایک فراموش شدہ مصنف اور اہل قلم کے مضامین کے انتخاب کی طبع و اشاعت پر وہ اور اردو اکاڈمی لائق تحسین ہیں،

پتیوں پر چھڑکاؤ :- مرتبہ جناب احمد جمال پاشا صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۰۰، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، قیمت ۳۰ روپے، پتے (۱) پاشا اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ "نشاط افزا" سیوان، بہار (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، دہلی، (۳) نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ لکھنؤ، (۴) بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ، ۴۔

جناب احمد جمال پاشا اردو کے ایک کامیاب اور اچھے طنز و مزاح نگار ہیں، ایک عرصہ تک روزنامہ قومی آواز لکھنؤ ان کی اس طرح کی نگارشات سے متمتع ہوتا رہا ہے، مگر اب وہ یوپی کو خیرباد کہکر بہار میں وارد ہو گئے ہیں، اور صحافت چھوڑ کر ایک کالج کے شعبۂ اردو سے منسلک ہو گئے ہیں، لیکن درس و تدریس کے ساتھ ہی طنز و مزاح نگاری کا شغل بھی جاری رکھے ہوئے ہیں، اب انھوں نے اپنے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا یہ مجموعہ شائع کیا ہے، پتہ نہیں وہ صدر شعبۂ اردو ہیں کہ نہیں، تاہم انھوں نے اپنی طنز و مزاح نگاری کے لیے بہت کچھ مواد صدر شعبہ سے بھی حاصل کئے ہیں، یہ مجموعہ بیس مضامین پر مشتمل ہے، ان میں ملک کے اعلیٰ متوسط اور ادنیٰ طبقوں اور مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص کی زندگی کے مضحک اور ناپسندیدہ پہلوؤں کی نشاندہی کرکے فکر و اصلاح کی دعوت دی ہے، ابتدا خود ادیبوں اور شاعروں کے طبقہ سے کی ہے، جس میں وہ خود بھی شامل ہیں، اس سلسلہ میں ادبی کانفرنس، سمینار اور مشاعرے ان کی طنز و مزاح نگاری کا نشانہ بنے ہیں، "جنت سے واپسی" میں دفتر کے ایک بابو اور کلرک کو موضوع سخن بنایا ہے، "محبوب کی فریاد" میں مولانا حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس میں شاعروں کے کردار، دور از کار تخیل اور خواہ مخواہ کی مضمون آفرینی کا خاکہ اڑایا ہے، اس کتاب میں وزیروں، لیڈروں، سرمایہ داروں، دانشوروں، ادیبوں اور سفید پوشوں ہر ایک کی ہو بہو اور واقعی تصویر پیش کی گئی ہے، فرقہ پرستوں کا ایک گروہ بھارتیہ کرن کی رٹ لگائے ہوئے ہے، اس کے ناوک نے مغلوں کی تعمیر کردہ عمارتوں کو بھی

نہیں چھوڑا ہے، احمد جمال پاشا نے اس "ذات شریف" سے بھی متعارف کرایا ہے، ایک مضمون میں انھوں نے دکھایا ہے کہ آجکل بچوں کے تعلیمی وظائف اور دوسرے فوائد حاصل کرنے کے لیے اعلیٰ طبقہ کے لوگ ذات تبدیل کرکے ادنیٰ طبقوں میں شامل ہو رہے ہیں، "ذکر اس پری وش کا" میں موجودہ معاشرہ کی اس عام بیماری کا تذکرہ ہے کہ لوگ خود کچھ نہ کرنے دھرنے کے باوجود دوسروں کی تنقید اور غیبت کو اپنا مشغلہ بنائے ہوئے ہیں، یہ سب مضامین احمد جمال پاشا صاحب کے گہرے مطالعہ و مشاہدہ کا نتیجہ ہیں، اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ملک و قوم کے حالات اور افراد کی ذہنیتوں، ان کی اداؤں اور حرکتوں اور اعمال و اشغال کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے اور پھر اسے خلوص و صداقت سے بے کم و کاست پیش کرکے سب کو سوچنے سمجھنے کی دعوت دی ہے، یہ کتاب دلچسپ بھی ہے، اور عبرت خیز بھی۔

پیام زندگی :- از مرزا احسان احمد صاحب مرتبہ جناب شفقت علاء الدین صاحب تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۶۰ مع خوبصورت پلاسٹک کور، قیمت بیس روپے، پتہ۔ احسان پبلشنگ ہاؤس، حدیث منزل، کٹرہ، اعظم گڈھ۔

مرزا احسان احمد مرحوم شعر و ادب کا بہت اچھا اور ستھرا ذوق رکھتے تھے، وہ اعظم گڈھ کے ایک کامیاب وکیل بھی تھے، لیکن اس پیشہ سے تعلق کے باوجود انھوں نے اپنے ذوق شعر و ادب کو پوری طرح قائم و برقرار رکھا، ان کو نظم و نثر دونوں پر قدرت تھی، اس لیے شعر و سخن کی زمین میں بھی گل بوٹے کھلائے ہیں، اور ادب و تنقید کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں، سنہ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے خود اپنا مجموعہ کلام "پیام کیف" کے نام سے شائع کیا تھا مگر ان کی مشق سخن کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا، اور ان کا اس زمانہ کا کلام مختلف رسالوں کی زینت بنتا رہا، جس کو انھوں نے محفوظ کر رکھا تھا، لیکن اپنی زندگی میں شائع نہیں کر سکے تھے، اب ان کی وفات کے طویل عرصہ بعد

ان کے بھتیجے شفقت علاء الدین بیگ نے ۱۹۷۲ء کے بعد کے کلام کا یہ مجموعہ شائع کیا ہے جو غزلوں کے علاوہ بعض قطعات و متفرق اشعار پر بھی مشتمل ہے، یہ پورا مجموعہ مرزا صاحب کے سنجیدہ اور پاکیزہ ذوق کا نمونہ ہے، مرزا صاحب کو تغزل سے خاص مناسبت ہے، ان کی غزلیں حسن و عشق کی بلند اور لطیف اداؤں کی ترجمان اور جوش و طرب انگیز اور سرور و نشاط بخش ہونے کے علاوہ سوقیت و رکاکت سے پاک ہوتی ہیں، ان کا نغمہ حیات زلف دراز کے افسانے کو بے کیف کر دیتا ہے، وہ عشق کو طبیب روحانی اور حیات ابدی کا سرچشمہ سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک تغزل کی بزم کیف و نشاط میں نوحہ و ماتم کی کوئی گنجایش نہیں، اس لیے وہ ہجوم غم میں بھی جوش مسرت سے اچھل پڑتے ہیں، اور کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتے، جناب شفقت علاء الدین جو کام کرتے ہیں محنت، لگن اور سلیقہ سے کرتے ہیں، انھوں نے مرزا احسان احمد مرحوم کے کلام کا یہ مجموعہ بھی اہتمام، نفاست اور سلیقہ سے شائع کیا ہے، جس کے لیے وہ ہمت افزائی اور قدردانی کے مستحق ہیں، شروع میں انھوں نے مرزا صاحب کے حالات اور سیرت و کمالات بیان کئے ہیں اور کلام کی خصوصیات بھی تحریر کی ہیں۔

انسان اور اس کا مستقبل: مرتبہ۔ جناب عبد الباسط قریشی صاحب۔ کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔ صفحات ۵۲۔ قیمت درج نہیں، پتہ مکتبہ دار العلوم الاسلامیہ، بستی

یہ ایک مفید دینی و دعوتی رسالہ ہے، اس میں بتایا گیا ہے، کہ انسان کی منزل آخرت ہے، دنیا میں اسے خدا کا منشا پورا کر کے مستقبل کی زندگی کو سرخرو بنانا چاہیے، اور جنت حاصل کرنی چاہیے، مصنف نے اسلامی ارکان اور اخلاق و معاملات کے متعلق اسلام کی ہدایات بھی مختصراً تحریر کی ہیں، جو اخروی زندگی کی فلاح کی ضامن ہیں، اللہ تعالےٰ اس کا نفع عام کرے۔

"ض"

جلد ۱۲۰ ماہ محرم الحرام ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۸۰ء عدد ۳

مضامین

مقالات